جوہر کائنات

(روحانی سائنس)

انسانی ارتقا کیلئے مذہب اور اُس کی افادیت

مصنف

مہاراج کرشن مادامسرور

فنکار کلچرل آرگنائزیشن سرینگر کشمیر



[illegible]

۱۵ . ۰۶ . 2012

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جوہر کائنات

انسانی اِرتقا کیلئے مذہب اور اُس کی افادیت

(روحانی سائنس)

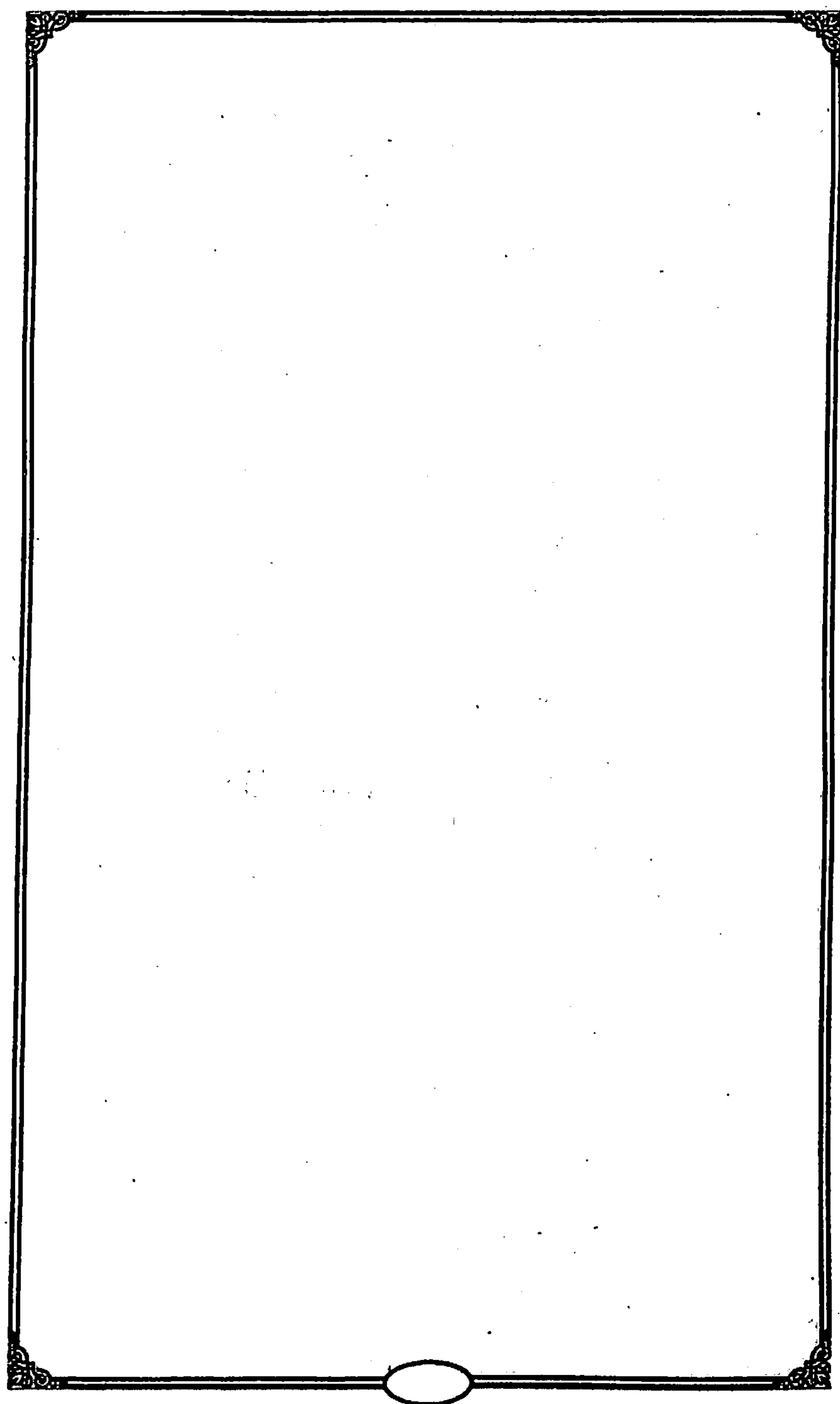
بنی نوعِ انسان کے لئے مذہب اور اُس کی افادیت

مصنف

مہاراج کرشن ماوا مسرور

ناشر

فنکار کلچرل آرگنائزیشن کشمیر





سوامی وویکانند کے چرنوں میں

نذرانۂ عقیدت

مہاراج کرشن ماوا مسرور

کتاب کا نام : جوہر کائنات

مصنف : مہاراج کرشن ماوا مسرور

ناشر : فنکار کلچرل آرگنائزیشن کشمیر

کمپوزنگ وڈیزائننگ : تنویر گرافکس M.:09213722053

طباعت : لاہوتی پریس دہلی ـ 6

تاریخ اشاعت : دسمبر 2011ء

قیمت : -/250 روپے

ملنے کا پتہ

☆ روی ماوا، A-41، گیٹ نمبر ـ 1، فریڈم فائٹرس کالونی، نیب سرائے، نئی دِلی-110068 ـ کنٹیکٹ نمبر: 09810259954

☆ فنکار کلچرل آرگنائزیشن

☆ پوسٹ بکس ۱۱۲۴، سرینگر، کنٹیکٹ: 9419092468

سرینگر: کتاب گھر، مولانا آزاد روڈ، سرینگر

جموں: کتاب گھر، کنال روڈ، جموں

''خُدا کے بندوں کی خدمت ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے''

''جوکوئی میری شرن میں آتا ہے میں یقیناً اُس تک پہنچتا ہوں۔
تم جس صورت میں مجھے تلاش کروگے میں اُسی صورت میں تمہیں ملونگا''

''سب انسان مجھ تک آنے میں کوشاں ہے اور آخرکار آ بھی پہونچیں گے
کیونکہ میں ہی سب راستوں کی منزل ہوں''
بھگوت گیتا۔

جو مجھ پر ایمان لائیگا میں اُس کے ساتھ ہوں۔
قرآن شریف۔

آؤ ہم کھُلے سمندر کی سیر کو نکلیں۔
سب اختلافات بھول کر۔ سب تفرقات مٹا کر۔
ہاتھ سے ہاتھ ملا کر۔ کندھے سے کندھا ملا کر۔
مت سوچو میں ہندو ہوں۔ میں مسلمان ہوں، میں عیسائی، میں سکھ۔
سوچو میں انسان ہوں۔

ایک مینڈک جو سمندر کے کنارے رہتا تھا ایک دِن کنویں کے مینڈک کے پاس گیا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا ''بھئی کہاں سے آئے ہو''

اُس نے جواب دیا ''سمندر سے آیا ہوں''

کنویں کے مینڈک نے کنویں میں ایک سرے سے دوسرے تک چھلانگ لگائی اور کہا'' سمندر! سمندر کیا میرے اِس کنویں سے بڑا ہے۔''

سمندر کا مینڈک مُسکرا کر بولا ''بھئی کہاں سمندر اور کہاں تمہارا یہ کنواں۔ اِن دونوں کا مقابلہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔''

کنویں کا مینڈک اکڑ کر بولا ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ چلو یہاں سے چلتے بنو۔ میرے اِس کنویں سے بڑی شے کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔''

ہمارے تفرقات کی بنیاد لاعلمی اور جہالت ہے۔

فہرست

خدا، مذہب اور عبادت

بندے کو خدا کے نزدیک اور خدا اور بندے کو ایک کرنے کے علم کا نام ہے مذہب۔ مذہب کا کام ہے انسان کو تلاش حق کے لئے آمادہ کرنا اور اس مشکل معیار کو حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کی تلقین کرنا اور اِس طرح اُس کی مشکلات کو دُور کر کے اُس کی ہمت باندھنا۔

ہر مذہب کا مقصد آدمی کو انسان بنانا اور اِنسانیت کو بُلند کر کے خدا تک لے جانا ہے۔

زندگی کا کمال مکمل آزادی میں مضمر ہے۔ جب انسان ہر بندش سے آزاد ہو جاتا ہے تو اپنے کمال کو پالیتا ہے۔ پاٹھ پوجا، بھجن کیرتن، زہد اور تقویٰ ترک اور ریاضت غرضیکہ عبادت اور پرستش کی ہر موجودہ صورت کے پس پردہ حصول آزادی ہی کی کوشش اور خواہش کارفرما ہے۔ انسان بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے اُن طاقتوں سے جنہیں وہ اپنے سے بڑا سمجھتا ہے مدد طلب کرتا ہے۔ یہی عبادت اور پرستش کی بنیاد ہے۔

خدا کیا ہے؟ خدا وجود، ہستی اور شعور نشاط (نشاط) کے کمال کا نام ہے۔ ہستی شعور اور مسرت جہاں بیک وقت کمال کو پہنچ گئے ہوں۔ عروج پر ہو وہی خدا ہے اور یہی خدا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔

ہماری رُوح آزادی کا نعرہ لگاتی ہے۔ جب سے انسان نے خدا کی آزاد ہستی کا تصور پایا ہے۔ وہ قدرت کی دوامی غلامی قبول کرنے کے لئے کسی صورت میں بھی راضی نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو قدرت کا آقا اور حاکم ہے اور جس کے اِشارے پر قدرت بھی ناچتی ہے۔ فطرت کی مجبوری اور خدا کے اختیار کے تصور دراصل دونوں اِس حقیقت کے دو رُخ ہیں جسے ہم آزادی مطلق کہہ سکتے ہیں۔

آزادی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ بظاہر ہماری آزادی ہر قدم پر قوانینِ قدرت کے پابند معلوم ہوتی ہے لیکن جتنا ہی مادّی دُنیا کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اِن وسیع بندشوں سے نکلنے کا خیال بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے۔ اور اس طرح ہمارے اندر ایک مسلسل جنگ جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ بھی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی دوسری۔ اور اِس طرح وقت اور مقام کے لحاظ سے انسانی اِرتقا کے مطابق مختلف

مذہب اور مسلک ظہور میں آئے ہیں اور نئے نئے اعتقاد والے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔

ابتدا میں نہ قرآن تھا نہ گیتا نہ بائبل نہ گرنتھ یہ سب ہمیں ایک ہی منزل کی طرف گامزن کرنے کے لئے اور مکمل آزاد کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس مکمل آزادی کے تصور کو مجسم کر کے ہم قادرِ مطلق یا خدا کہتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب انسان کے ضمیر میں ناپاکیزگی اور گناہ کا خیال بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں انسان جہالت اور پستی سے نکل رہا ہے مذہب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

غلامی اور آزادی، روشنی اور اندھیرا، نیکی اور بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے انسان کو مذہب کی ضرورت ہر حالت میں ہر دور میں اور ہر وقت ضرورت ہے ضرورت تھی اور ضرورت رہے گی۔

تمام عالم ایک عبادت گاہ ہے اور قدرت کی ہر جنبش اور ہر حرکت خدا کی پرستش کی ایک صورت ہے چونکہ مکمل آزادی اور اختیار کل کا نام ہی خدائی ہے اس لئے آزادی کی جستجو خدا کی تلاش اور خدا کی عبادت ہے۔ حصول آزادی کا مطلب ہی وصل الٰہی ہے اور سچی

نجات ہے۔

زندگی کی چمک، قدرت کا حسن جمال عالم کائنات کی تابانی، سب اُسی ادنیٰ نور سے پیدا ہوئے ہیں جسے ہم خدا یا بھگوان کہتے ہیں۔ دُنیا میں جہاں کہیں بھی نور کی کرنیں نظر آتی ہیں سب اُسی کا عکس ہیں۔ سورج کی تاب تپش بھی اُسی سے ہے اور ہمارے خمیر کی روشنی بھی وہی ہے۔ وہ ہر طرف نور پاش ہے، اُسی کے نور سے سب چیزیں روشن ہیں۔

خدا اپنا ثبوت آپ ہے، وہی آقا و مالک ہے۔ وہی شہنشاہ عالم ہے دانائے کُل ہے۔ آزاد مطلق ہے، وہی سب کے سجدوں کا آستان ہے۔

خدا اگر مکمل آزادی کا نام ہے تو اُس آزادی کو حاصل کرنے کی ہر کوشش اُس کی پوجا ہے عبادت ہے پرستش ہے۔ آزادی کی یہ تمنا عالم کائنات کے ذرّے ذرّے میں موجود ہے۔ زندگی کی ہر دھڑکن کی محرک ہے۔ حیات عالم کے وجود میں بس یہی واحد دِل دھڑک رہا ہے۔

آزادی تو تب ہی ملتی ہے جب انسان سُکھ اور دُکھ دونوں

سے بالا ہو جاتا ہے۔ سکھ بھوگ کر اور دُکھ سے بھاگ کر آزادی دستیاب نہیں ہو سکتی۔

ہم سب کو دُکھ سُکھ کا سامنا کرنا ہے اور اُن سے گذرنا ہے۔ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے خوف ناک اور دہشت ناگ چیزوں کا دلیری سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔

اُپنشد کہتے ہیں ہماری اصل اور خدا درحقیقت ایک ہے، بندہ اور خدا اصل میں دو نہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہیں لیکن اُس کے لئے وُسعت نظر چاہئے۔ ہمیں خدا کے پورے جلوے کے دید تاب پیدا کرنی ہوگی۔ فقط برکت اور رحمت، نیکی اور بھلائی، حسن اور جمال، رنگ اور نکہت میں ہی نہیں بلکہ ظلم اور قہر، آفت اور مصیبت، رنج اور نم، گناہ اور ثواب میں بھی اُسی ایک ہستی کا جلوہ دیکھنے کی اہلیت پیدا کرنا ہوگی۔

خدا نیکی اور برائی دونوں کا خدا ہے۔ ہمیں اِسی خدا کو قبول کرنا ہے جو نیکی کا بھی خدا ہے اور برائی کا بھی خدا ہے۔ یہی نجات اور مکمل آزادی حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے اور اِسی طریقے سے انسان کو آخری حقیقت کا شعور اور احساس ہوتا ہے جسے وحدت الوجود

کہتے ہیں۔

ہم گناہ اور ثواب دونوں کو خدا کے وجود میں شامل کر لیتے ہیں تو بھلے اور بُرے کا فرق اور امتیاز مِٹ جاتا ہے۔ ہمارا دماغ اِن تفرقات کی بندشوں سے آزاد ہونے لگتا ہے۔ جب نظر میں بس اُسی کا جلوہ ہو۔ جب ہر شے میں ہر جگہ اور ہر وقت وہی نظر آئے۔ تو فرق اور امتیاز کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

دراصل ہماری ہستی خدا کی ہستی سے جدا نہیں، ہستی تو ایک ہے اُس کے عکس کی مختلف صورتوں سے کثرت کا دھوکا ہوتا ہے جیسے سورج ایک ہے لیکن شبنم کے لاکھوں قطروں میں اُس کا عکس ہے۔ اِسی طرح حقیقت ایک ہے اور اُس کے جلوے بے شمار ہیں۔ جس طرح شبنم کے قطرے بخارات بن جاتے ہیں اور لاکھوں سورج غائب ہو جاتے ہیں اور ایک ہی سورج رہ جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کی واحد ہستی کے کروڑوں عکس جب سمٹ جاتے ہیں، تو وہی ایک حقیقت رہ جاتی ہے۔

آیئے ہم مختلف مذہبی فرقوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ ''خداؤں'' کی پرستش اور عبادت کی حدود سے باہر نکل جائیں تا کہ ہمیں ہر طرف اور ہر

جگہ خدا ہی خدا نظر آئے۔ یہی سچی آگہی ہے۔ یہی علم معرفت ہے اور یہ وہ حالت ہے جب خارجی اور داخلی دُنیا میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک طرف دِل کے مندر میں ہر وقت بھگوان کی پوجا ہوتی ہے اور دوسری طرف عالم کائنات کی ہر شئے سربسجود نظر آتی ہے۔ اور خدا کی عبادت کے مختلف طریقوں کا فرق مِٹ جاتا ہے۔ اور ہر شخص کا مخصوص طریقہ ہر لحاظ سے حق بجانب نظر آنے لگتا ہے۔

جب ہمیں اس وحدت کا پورا احساس ہو جائے گا تو ہم "امیر" ہو جائیں گے۔

اعلان کردو کہ میں کوئی محدود ہستی نہیں ہوں۔ میری ہستی کائناتی ہے۔ انسانی اِرتقا کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں تفرقات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔

انسانی مذہب کی بلند ترین تعلیم وہ ہے جو ہمیں کائناتی وحدت کا راز بتاتی ہے۔

اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اپنی ذات کا انکشاف ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ اپنی زندگی کو اِس خیال سے تشکیل دو کہ میری ہستی کائناتی ہے۔

خدا روح عظیم ہے۔ رُوح پاک ہے۔ اور تم بھی اپنی رُوح کو پاک کردو۔ روح کا واسطہ رُوح سے ہی ہوسکتا ہے۔

لامحدود کائناتی ہستی کی سچی عبادت رُوح کی وساطت سے ہی ہوسکتی ہے۔ ہر محدود چیز مادّی ہے۔ فقط روح لامحدود ہے۔

انسان تو در اصل رُوح ہے اور لامحدود ہے۔ لا محدود کی عبادت لامحدود ہی کرسکتا ہے۔ لامحدود کو لامحدود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اور پاسکتا ہے۔ یہی عمل ہے یہی علم ہے یہی سچی آگہی۔ اور اسی کو روحانیت کہتے ہیں۔

"عمل ہی ہر مذہب کی جان ہے"۔

سب مذہبوں کی منزل مقصود ایک ہے۔ سب علم، سب فلسفے، سب سائنس ایک ہی منزل کی نشاندہی کررہے ہیں اللہ ہم کو توفیق دے کہ ہم اُس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں۔ آمین



سائنس اور مذہب

ہر مذہب کا دعویٰ ہے کہ خارجی علوم ہماری زندگی کے ایک جزو کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن داخلی عرفان جو مذہب سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں لامحدود اور لازوال حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور اِس کا درجہ سب علوم سے بلند ہے۔

سب سے اعلیٰ علم وہی ہے جس کی مدد سے ہم اس کائنات کی بنیاد یعنی خدا کو پاسکتے ہیں اور اسی علم کا نام مذہب ہے۔

علم اور عقل کا گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے اگر مذہب عقل کا چیلنج قبول نہیں کر سکتا تو یہ مذہب ایک دھوکہ۔ ایک بناوٹ اور فضول ہے۔ ایسا مذہب کا مِٹ جانا ہی اچھا ہے۔

مذہب کوئی وہم نہیں، خواب یا خیال نہیں بلکہ روحانیت ایک روشن حقیقت ہے۔

ہم میں سے بیشتر لوگ کسی خاص مذہبی رہنے پر ایمان لانے کو

ہی مذہب سمجھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ہمارا مذہب ہی سچا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میری مذہبی کتاب میں کوئی خاص بات ہے وہ دوسرے کی کتاب میں نہیں ہے۔ میرا اگر طرز زندگی ایک ہے تو دوسرے کا دوسرا، اس طرح یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوجاتی ہے اور ہورہی ہے۔

اگر دو مقدس کتابوں میں دو ایسی باتیں لکھی ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہو۔ تو کونسا معیار ہے جس کی رُو سے ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی۔ ہر مذہب کے حامی اپنی کتاب کی حمایت میں یہی ایک دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہماری بات خدا کے اُن احکامات پر مبنی ہے جو خدا نے ہمارے اوتار یا پیغمبر کی معرفت عائد کئے ہیں، ظاہر ہے کہ جب مذہبی کتابوں میں تضاد ہو یا کوئی بات ثابت نہیں ہوسکتی تو ہمیں کوئی ایسا معیار دریافت کرنا ہوگا جو اِن کتابوں سے بھی بلند ہوگا اور جس کی مدد سے مختلف مذہبی احکام کے حق و باطل کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اور اگر یہ کوئی کسوٹی ہے تو یہ معیار عقل اور منطق کا ہی ہوسکتا ہے۔ اگر مذہبی کتابوں میں اختلاف ہے تو اِس کا فیصلہ عقل ہی کرسکتی ہے۔

البتہ شرط یہ ہے کہ عقل کو گمراہ نہ ہونے دیا جائے۔ عقل سے خلاف فطرت کام نہ لیا جائے اور نہ لیا گیا ہو۔ زمانہ حال کی غیر مذہبی اور سائنسی معلومات کی روشنی میں مذہبی اُصولوں اور اخلاقیات کا تجزیہ کیا جائے، تا کہ اگر مذہب اور روحانیت کی کوئی حقیقت ہے تو وہ ثابت ہو جائے۔

دلیل اور منطق کا اصول ہے کہ کسی محدود چیز کی تشریح اُس سے کم محدود چیز کی نسبت سے کیا جائے۔ اسی دلیل کو مدنظر رکھ کر ہم سب مرد، عورت، بچے، بوڑھے یا جوان سب انسان کہلاتے ہیں۔ ہم بنی نوع انسان کا ذکر یوں کرتے ہیں گویا سب کا وجود ایک ہو۔ اسی طرح آدمی، بلی، کُتا، یا دوسرے جاندار یا جانوروں کی مختلف اِنفرادی نوعیت الگ الگ ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم سب جاندار ہیں۔ اور اِس سے آگے بڑھے تو ہم نباتات کو بھی اپنے میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور سب کو زندگی یا حیات کہتے ہیں اور آخر میں مادیات کو بھی اِسی مجموعے سے ملا کر وجود کا نام دیتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہی ہے کہ ہم محدود چیز کو وسیع تر چیز سے نسبت دیتے ہوئے ایک کائناتی اصول دریافت کر لیتے ہیں اور یہ اُصول دریافت کرتا۔ محدود کو لامحدود اور لامحدود کو محدود کرنا صرف

عقل کا کام ہے۔

سائنس کیا ہے؟ جس کی آج دھوم مچی ہوئی ہے ''صرف عقل کا استعمال'' عقل کا استعمال ہے شعور، اسی شعور کی بدولت ارتقا کا عمل جاری ہے جس کا اظہار آج مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔

اگر سائنس نے کوئی بات ثابت کر دی ہے تو وہ ہے ''وحدت حیات'' کا نظریہ۔ یہ وحدت نہ صرف روحانی ہے بلکہ دماغی بھی اور جسمانی بھی۔کون کہتا ہے کہ ہم جسمانی طور مختلف ہیں، فرض کیجئے کہ ہم مادہ پرست اور کسی کائناتی ہستی یا خدا میں یقین نہیں رکھتے پھر بھی ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ تمام کائنات مادے کا بے کنار سمندر ہے جس میں ہر ایک جاندار، گرداب کی طرح اپنی انفرادیت کے چکر میں کچھ دیر رہ کر بھی اِسی سمندر کی لہروں میں کھو جاتا ہے۔ دُنیا کی ہر شے ہر گھڑی اپنی صورت بدلتی رہتی ہے۔

ہمارا دماغ ہی لیجئے، دماغ بھی شعور اور احساس کے بے کراں سمندر میں ایک گرداب کی صورت رکھتا ہے۔ ہمارے دماغ ایک جیسے ہیں۔ جو حال میرے دماغ کا ہے وہی حال آپ کے دماغ کا بھی ہے۔ اور اِسی طرح جسم اور دماغ سے اُوپر اُٹھئے تو رُوح ایک ہے۔ اور رُوح

کی حالت ایک جیسی ہے۔

رُوح جسم اور دماغ کی وہ واحد قوت معرکہ ہے جس سے ان دونوں کی تشکیل ہوتی ہے۔اس طرح ہم نے دیکھ لیا کہ دراصل ہم جسمانی دماغی اور وحانی لحاظ سے ایک دوسرے سے جُدا نہیں۔ہم سب ایک بنیادی "وحدت مشترکہ" کے حصہ دار ہیں اور یہ اُصول سائنس کی دریافت ہے۔ہمیں کتنا غرور ہے کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں،لیکن سائنس بتاتی ہے کہ ایک اعلیٰ ترین انسان اور ایک کمترین کیڑے میں طبعائی اور کیمیائی لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

شکر ہے کہ سائنس کی بدولت ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ رہے ہیں۔سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادّی سطح پر زندگی ایک ہے اور اسطرح اس تعلیم سے مذہب کو تقویت پہونچتی ہے کیونکہ مذہب بھی یہی سکھاتا ہے کہ دماغی اور روحانی سطح پر زندگی ایک ہے۔

دُنیا کے تمام دُکھ دراصل احساس تفریق سے پیدا ہوجاتے ہیں۔لیکن جب ہمیں وحدت اور یکسانیت کا احساس ہوگا سچی خوشی "نشاط کامل" اور اس طرح احساس خودی پیدا ہوگا اور ہم کائناتی وجود ہوجائیں گے۔

ہم سمجھیں گے کہ میں اور کائنات ایک ہے، میں اِس کائنات کا ایک حصہ دار ہوں۔

مذہب وہی سچا ہے جو سائنسی دلائل پر پورا اُترے۔ مذہب میں جس خدا کا تصور ملتا ہے وہ ایک ایسی وحدت ہے جس سے باہر کچھ بھی نہیں انسان بھی اِسی وحدت کا ایک حصہ ہے اور یہی وحدت سب کچھ ہے۔ وحدت کی حرکت سے ہم میں جان ہے۔ ہماری ہستی ہے۔ وحدت ہی کائنات کا رس ہے رُوح رواں ہے اور دُنیا کی ہر شئے میں جلوہ گر ہے۔

وجود شعور کا بے کنار سمندر ہے۔ ہم اور آپ اس سمندر میں چھوٹے چھوٹے قطرے ہیں۔ ہماری ہستی خدا، خدا کی ہستی سے جدا نہیں۔ ہم اُس نور مجسم کی کرنیں ہیں۔

خدا اگر مکمل بیان ہے تو ہم چھوٹے چھوٹے الفاظ۔ ہمیں اگر آپس میں کوئی فرق نظر آتا ہے تو یہ فرق نوعیت کا ہے۔ درجے کا نہیں، فرق ہے تو اِرتقاء کے مقام کا۔ کوئی اِرتقا کی اونچی منزل پر ہے۔ اور کوئی نیچے۔ لیکن ہم سب خدا کے نور کی جلوہ گاہ میں ہیں۔

نیکی اور بدی کیا ہے؟ نیکی ارتقاء کی زیادہ اونچی منزل ہے۔

نیکی میں اُس کا جلوہ زیادہ روشن ہوتا ہے۔اور بدی میں کم۔جس ہستی کو ہم لامحدود غیر شخصی خدا کہتے ہیں۔ اُس کی مثال اُس مٹی کی ہے جو لاکھوں کروڑوں مجسموں کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں۔مٹی سے بہت بڑے ہاتھی کا مجسمہ بھی بنایا جاسکتا ہےاور ایک چھوٹا سا چوہا بھی۔ چوہا ہاتھی نہیں بن سکتا۔لیکن دونوں کو پھر پانی میں گھول کر برابر کیا جاسکتا ہے۔

لیکن جب تک مٹی نے چوہے اور ہاتھی کی شکل اختیار کی ہے دونوں میں ہمیشہ فرق نظر آئیگا۔

اسلئے آؤ ہم اُس یزدانی طاقت سے اُس نورِ مجسم سے ایک دُعا مانگیں۔

دُعا

دُعا یہ نہیں کہ خُدایا میرے سر کا درد ٹھیک کر، یہ نہیں خدایا مجھے بچے۔ مجھے روپے دیجئے۔ دولت دیجئے، مکان دیجئے، ایسی خواہشات کے پورا کرنے میں ہم سنت سادھو۔ درویش فقیر سے مدد لے سکتے ہیں جو

اِرتقاء کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچ چکے ہیں اور جنہوں نے ہم سے زیادہ طاقت حاصل کی ہے۔ لیکن اُس شہنشاہ عالم سے اِس قسم کی دُعا مانگ کر اپنا اور اپنے خدا کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔

خدا سے دُعا مانگنی ہے تو خدا کو مانگئے۔ اُن چیزوں کو مانگئے جو ہمیں اُس تک لے جاسکتی ہے۔ یقیناً بیوقوف ہے وہ شخص جو ہیروں کی کان میں جاکر کوئلوں کی تلاش کرتا ہے۔ گنگا کے کنارے ایک بوند پانی مانگ رہا ہے۔ ارے گنگا تک جاکر امرت پیجئے۔

ہیروں کی کان میں جاکر ہیرے دامن میں بھر لیجئے، کس قدر کم عقلی ہے کہ ہم برکت ورحمت کے سرچشمہ سے محبت وشفقت کے دریا سے آب حیات کے بجائے کنکر اور ریت طلب کر رہے ہیں جس ہستی سے ہمیں علم و آگہی کا عالم تاب نور مِل سکتا ہے۔ اُس سے ہم خواہشات کے ٹمٹماتے دیئے مانگ لیتے ہیں۔

آیئے ہم خدا سے آگہی۔ طاقت اور محبت کی مانگ کریں۔ یہ سب ہمیں سنت سادھو، فقیر درویش یا اور کوئی نہیں دے سکتا۔

دُعا کریں کہ ہمارے دِل ودماغ اُس کے نور سے چمک اُٹھے اور ہماری رگ رگ میں اُس کی لازوال محبت جاگ اُٹھے۔

ہماری دُعا میں احساس کمتری کا کوئی دخل نہ ہو۔ ہماری دُعا تو انا الحق کا نعرہ بن کر گونج اُٹھے۔ میں اگر اُس کے دروازے پر مانگنے آیا ہوں تو کون آیا ہے؟ میں فلاں ہوں۔ میں فلاں شخص ہوں۔ نہیں میں تو ہوں میرے محبوب، دروازہ خود کُھل جائے گا۔ یہ ہے دُعا، یہ ہونی چاہئے دُعا۔ انسان یزدانی طاقت کا مجسمہ ہے۔ ضرورت ہے اِس طاقت وتوانائی کو اُجاگر کرنے کی کمزوری سے جہالت پیدا ہوتی ہے۔ جہالت دُکھوں کی جڑ ہے۔ سچی طاقت اُس میں ہے جو اپنے مالک سے ایک ہوگیا ہو۔

دل میں خوف کا نام ونشان نہ ہو اور اُسی کا جلوہ گر ہو۔

سچی عبادت سچی پوجا یہی ہے کہ کائنات کو اپنے میں سمو کر اپنے معلیٰ سے ایک ہو جاؤ۔ میں اور میں کا فرق بھول جاؤ۔

غریب اور امیر، مرد اور عورت سب کا "وہی" ہے، احساس ہستی ایک ہے وہی سب میں جلوہ گر ہے۔

سچا مذہب اور سچا علم وہی ہے جو ہمیں خُدا اور اُس کی کائنات سے ایک کر رہے۔



مذہب کی قوت

نسل انسانی کی تقدیر بنانے میں جو قوتیں بیشتر کام کرتی رہی ہیں اُن میں اس قوت سے زیادہ عظیم یقیناً اور کوئی قوت نہیں جس کے ظہور کا نام مذہب ہے۔ مذہب کا رشتہ نسلی۔ جغرافیائی، قومی اور خاندانی رشتوں کے مقابلے زیادہ پائدار ثابت ہوا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور کہاں سے ہوئی؟

ایک نظریہ کی رُو سے مذہب کی ابتدا اس خیال سے ہوئی کہ ''مرنے کے بعد بھی کوئی چیز باقی رہتی ہے اور وہ ہے رُوح۔

دوسرے نظریہ کے مطابق ''محدودیت'' کے احساس کے دائرے سے نکل کر لامحدودیت اور آزادی کے خیال کی اِرتقاء ہی کا نام مذہب ہے۔

آریوں کے قدیم ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی ابتداء

قدرت کی پرستش سے شروع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دِماغ مناظر قدرت کے پس پردہ حقیقت کا متلاشی رہا ہے اور اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جدوجہد کررہا ہے۔ یہ علی الصباح نور کے تڑکے کا سماں، یہ شام کا دِلفریب منظر، فطرت کے حُسن جمال کی یہ دِلکش صورتیں اور اُس کے برعکس یہ طلاطم وطوفان کی کیفیت، فطرت کی یہ عظیم اور ہیبت ناک قوتیں ایسی ہی تمام چیزیں انسانی دِماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اُسے اپنی نوعیت سمجھنے کے لئے متحرک کرتی ہے۔ انسان اِن مناظرات سے گذر کر حقیقت تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔

اِس کوشش کے دوران مناظر فطرت کے پیچھے قوتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے اور انسانی تخیل اور اِن مختلف قوتوں کو مجسم کرتا ہے۔ اُن کو شعور بخشتا ہے اور یہیں سے مذہب کی ابتدا ہوتی ہے۔

گویا مذہب کی ابتدا قوتوں کی تجسم وتشکیل سے ہوئی ہے۔ انسان کی فطرت بھی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی ''بندشوں'' سے اور ''محدودت'' سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ وہ ایک جھلک اُس چیز کو دیکھنا چاہتا ہے جو جسم کے فنا ہونے کے بعد باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ اس طاقت کے راز کو سمجھنا چاہتا ہے جو فطرت کے اس مظاہرہ عظیم کے

پس پشت کارفرما ہے۔ جب ہم سوئے ہوتے ہیں اور ہمارے جسم بظاہر بے جان پڑے ہوئے نظر آتے ہیں تو بھی ہمارا دِماغ اپنا پُر پیچ کام سر انجام دیئے جاتا ہے۔ خواب کی حالت میں بھی دماغ کا کام جاری رہتا ہے۔ تو کیا اِسی جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی اس کی کاروائی جاری رہ سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیا موت کے بعد بھی زندگی ممکن ہے؟ مذہب اور روحانیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ خوابوں پر غور خوض کرتے کرتے انسان کے دِل میں حیات جاودانی کا خیال جنم لیتا ہے اور اِسی خیال سے ہستی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

انسان ابتدا سے ہی اپنے دِل و دماغ کی مختلف حالتوں کا نہایت گہرا مطالعہ کرتا رہا ہے اور اُس نے بیداری و خواب دونوں حالتوں سے بھی زیادہ بلند مدارج دریافت کئے ہیں۔ اِن مقامات کا ذِکر دُنیا کے ہر مذہب میں آتا ہے۔ اور کوئی اِسے ''الہام'' کے نام سے پکارتا ہے اور کوئی اِسے آنند مستی کہتا ہے۔

تمام منظم مذاہب کے بانیوں، پیغمبروں، رسولوں یا اوتاروں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن پر ایسی دماغی کیفیات طاری ہوا کرتی تھی جنہیں نہ بیداری کہہ سکتے ہیں اور نہ خواب۔ ایسی حالت میں وہ حقائق

کے ایک نئے سلسلے کا مشاہدہ بہ چشم خود کرتے تھے۔

اور اِن مشاہدات کو ہی روحانیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ روحانی حقیقتیں محض خواب وخیال اور تصورات پر مبنی نہیں بلکہ مجسم ہو کر اُن کے روبرو آجاتی تھی۔

مختصر یہ کہ دُنیا کے سب مذاہب کا یہ زبردست دعویٰ ہے کہ بعض لمحوں میں انسانی دماغ محض حواس کے نفسیات سے ہی نہیں گذرتا بلکہ علت و دلیل کی حدود کو بھی پار کر جاتا ہے اور ایسی حالت میں اُس کے سامنے ایسے حقائق پیش ہوتے ہیں جن کا علم ہم کو نہ کبھی حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ عقل و دلیل کی مدد سے اور اس طرح دُنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اِنہیں حقائق پر قائم ہے۔

ہمیں یقیناً اِن حقائق کو جانچ پڑتال کرنے اور اُن کو عقل و دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کا پورا حق حاصل ہے۔

تمام مذاہب اِس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کے پس پردہ و یک معیاری وحدت مطلق ہے اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس حقیقت کو مختلف مذاہب کس صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اِسے شخصی خدا کہتے ہیں یا غیر شخصی وجود یا اخلاقی قانون یا غیر مرئی حاضر و ناظر

ہستی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک معیار رکھ دیا گیا ہے اور اس معیار تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی سے مذہب اور روحانیت کی ابتدا ہوئی ہے۔

ہر مذہب کی بنیاد کچھ اخلاقی قوانین پر رکھی گئی ہے۔ جس میں سب سے پہلا اُصول ہے "ترک" اخلاق کا تقاضا ہے کہ آپ دوسروں کو اپنے سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھیں۔ لیکن حواس کا تقاضا ہے پہلے میں اور بعد میں کوئی اور، اخلاق ہمیشہ پہلے آپ کا سبق دیتا ہے اور اخلاق ترک وایثار کا ہی دوسرا نام ہے۔

انسان اونچا اُٹھنے کے مختلف طریقوں کا دریافت کرتا ہے اور اسی تلاش وتجسس سے اخلاق کے مختلف قوانین کی تخلیق وتشکیل ہوتی ہے۔ اور یہ سب قوانین نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے۔

انسانی اِرتقاء کا عمل ہمیشہ سے جاری ہے، ہمارے سماج کی تشکیل بھی اِسی عمل کی ایک صورت ہے جو ہمیشہ سے تبدیل ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی، کل کے اخلاقی قوانین آج لازمی طور پر عاید نہیں ہو سکتے۔ لیکن جن اخلاقی ضوابطہ کا دار ومدار مذہب اور رُوحانیت پر

ہے اُن کا دائرہ عمل بہت وسیع ہوتا ہے۔ اُن کا اطلاق انسان اور خدا کے دوامی روابط پر ہوتا ہے۔ سماج چونکہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اور آدمی چونکہ سماج کا جزو ہے اسلئے اِن کا اطلاق لازماً سماج پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح صاف ظاہر ہے کہ سماجی اخلاقیات کے لئے بھی رُوحانیت اور مذہب کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان مذہب اور روحانیت کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔

مادّی چیزوں کا خیال خواہ کتنا ہی مسرت بخش کیوں نہ ہو دیر پا نہیں ہوتا۔ انسان ہمیشہ مادّی چیزوں کے خیال سے خوش نہیں رہ سکتا۔ انسان اُس وقت تک ہی انسان کہلائے جانے کا حقدار ہے جب تک وہ مقام فطرت سے بلند ہونے کے لئے جدو جہد کرتا ہے۔ یہ فطرت باطنی بھی ہوتی ہے اور خارجی بھی۔

خارجی فطرت کو قابو میں لانا ایک شاندار کارنامہ ہے لیکن اُس سے بھی کہیں زیادہ شاندار کارنامہ ہے اپنی اندرونی فطرت کو اُجاگر کر کے مسخور کر لینا۔

بنی نوع انسان کے جذبات واحساسات اور اِرادوں کی تحریک کا مشاہدہ نہایت ہی عظیم کارنامہ ہے اور یہ علم و آگہی کی نعمت و مذہت

کے حصے میں آئی ہے۔

انسان کے اِس باطنی وجود پر فتح پالینا۔ انسانی دماغ کے اندر جولطیف ترین عمل جاری رہتا ہے اُس کے پوشیدہ نکات کو سمجھنا اور اُن حسرت انگیز رازوں کو جاننا مذہب کا ہی کام ہے۔

اگر ہم تواریخ یا اقوام عالم کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ جس کسی قوم میں مذہبی بزرگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہ قوم ترقی اور عروج کی منزلیں طے کرتی جاتی ہے۔ لیکن جب اِن خدا رسیدہ بزرگوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور تلاش حق کے شیدائی اور لا محدودیت کے دِلدادہ اشخاص آہستہ آہستہ گھٹتے چلے جاتے ہیں تو اُس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

"ہر قوم کی طاقت کا سر چشمہ اُس کی روحانیت ہوتی ہے۔

مذہب بحیثیت ایک سائنس کے مطالعہ اور تحقیقات کا ایک زبردست موضوع ہے۔ اپنی لامحدود ذات کے خیال سے رُوح کے تصور سے زیادہ وسیع موضوع اور کون ہو سکتا ہے۔

اِسی لئے نشاط روح کی کوئی حد نہیں۔ روحانیت کا مقام سب سے بلند ہے۔

رُوحانی مسرت اور سُرور سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں۔

انسان مذہب کے ذریعہ ذات کو سمجھ سکتا ہے اور اپنی لامحدود اور لاانتہا قوت کو بیدار کرسکتا ہے۔ مذہب ہی وہ معیار ہے جو انسان کے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور اُسے نیکی، خوبی اور عظمت کے زیوروں سے مزین کرتا ہے۔

مذہب ہی امن، آشتی کی تعلیم دے کر انسان کو دوسروں کے لئے باعث تسکین و مسرت بناتا ہے۔ اِسی سے اطمینان قلب کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

سچے مذہب میں تنگ، محدود اور تفرقہ پرواز حالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ انسان دماغ میں جتنی کشادگی آتی جاتی ہے اُس کا روحانی دائرہ بھی اُتنا ہی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے مذہبی تصورات کو عالم گیر۔ لامحدود اور وسیع المشرب ہونا پڑیگا۔ اسلئے دُنیا کے تمام مذاہب کو عالمگیر اور وسیع ہونا پڑیگا تب ہی مذہب صحیح معنوں میں دُنیا کی بھلائی اور بہبودی کی ایک لامحدود طاقت بن جائے گا۔ تنگ نظری مذہب کی دُشمن ہے۔ کشادہ دِلی اور ہمہ گیری سچے مذہب کی نشانی ہے۔ ہمیں مختلف مذاہب کے تفرقات اور جھگڑے مٹا کر اِن میں مشترکہ روایات کو قائم و

دائم رکھتا ہوگا۔ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ ہر مذہب کا ایک ہی مشترکہ مقام ہے ایک ہی منزل ہے۔ اور ایک ہی مفاد ہے۔

اگر ایک مذہب والے دوسرے مذہب کو غلط اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ خود اپنے مذہب کو غلط اور جھوٹا بتاتے ہیں کیونکہ سب مذہب خدا کا راستہ بتاتے ہیں اور دِکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر ایک سچا ہے تو سبھی سچے ہیں اور اگر ایک جھوٹا ہے تو سبھی جھوٹے۔ باقی رہا سائنس۔

مذہب اور سائنس کے موضوع ہی مختلف ہیں اس لئے اِن دونوں کے درمیان بظاہر تضاد لازمی نظر آتا ہے۔ لیکن دونوں ایک ہی علم کی آگہی کی شاخیں ہیں۔ مذہب کے مطالعہ کا تعلق دماغی کیفیات سے ہے اور سائنس کا میدان فکر و ذہن سے آسمان تک تمام مادّی چیزوں پر حاوی ہے۔ مذہب اور سائنس حرف ایک ہی مادّی اور غیر مادّی صورتیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم ایک ہی ہے۔

علم بذاتِ خود انکشاف ذات کی صورت ہے ہر قسم کا علم روحانیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

ہر علم کا مقصد حقیقت واحد سے حاصل ہو جانا ہے جو لامحدود

ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ مثال۔ جو لازوال ہے اور لاثانی ہے۔ جو مادّی اور غیر مادّی دونوں قسم کے علم سے پرے ہے۔ جسے ہندو بھگوان کہتے ہیں اور مسلمان خدا، عیسائی God اور کئی دوسرے کئی کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔



مذہبی وحدت

زندگی کے ہر شعبے میں دو متضاد طاقتیں کام کرتی ہیں۔ ایک طاقت عمل اور دوسری ردِ عمل۔ اِن طاقتوں کے عمل کا شعور نہ صرف حواس کی حدود کے اندر ہوتا بلکہ ہمارے دماغی تصورات اور تخلیات کی عظیم وسعتوں میں بھی یہ دونوں متضاد طاقتیں کارفرما رہتی ہے۔ یہی طاقتیں جب خارجی یا داخلی دُنیا میں رونما ہوتی ہے تو ان سے محبت اور نفرت اور نیکی یا بدی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔

مذہب نے جہاں انسان کی گہری سے گہری محبت کو جنم دیا ہے وہاں نفرت کا شیطانی جذبہ بھی مذہب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جہاں مذہب کی وجہ سے دُنیا میں کارِ خیر کے کروڑوں کام ہوتے ہیں وہاں اِس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ دُنیا میں جتینی خون ریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے شاید ہی کسی اور وجہ سے ہوئی ہو۔ مذقب نے ہمیں رحم اور ہمدردی کے جذبات بخش کر نرم دِل بنایا اور مذہب کے نام

پر ہر طرح کے ظلم اور بے رحمانہ افعال کا ارتکاب بھی ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وجہ یہی ہے کہ مذہب بجائے عمل کے دکھاوے کی چیز بن گیا ہے۔ ایک انفرادی طرز عمل کے بجائے ایک سماجی اور قومی اثاثہ بن گیا اور اس طرح مذہب قومیت اور حب الوطنی کا بن کر رہ گیا ہے۔ آج وقت کی اہم ضرورت ہے کہ ہم اتحاد مذاہب کے مسئلے پر غور کریں۔

ہر بڑے اور منظم مذہب کے تین اجزا ہوتے ہیں۔

۱۔ پہلا حصہ فلسفے پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ اسکے بنیادی اصول پیش کئے جاتے ہیں۔

۲۔ دوسرا حصہ دیو مالا۔ جس میں فلسفے کو ٹھوس اور مادّی شکل دے کر پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ ہوتا ہے شریعت یا کرم کانڈ۔ اسی کی شکل اور بھی مجسم اور مادی ہوتی ہے۔ یہ مشتمل ہوتا ہے چند دستوروں اور رسموں پر اور انہیں میں ارکان عبادت یا پوجا پاٹھ رسمیں بھی شامل ہوتی ہے۔

یہ تینوں حصے تمام مروجہ مذاہب میں پائے جاتے ہیں کئی جگہ ایک حصہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کسی میں دوسرے حصہ پر۔

ہر مذہب کی اپنی اپنی جداگانہ دیو مالا ہوتی ہے۔ یہ دیو مالا چاہے کسی بھی مذہب کی کیوں نہ ہو محض مثالی افسانے ہیں جن میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی تاریخی واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

آیئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا اِن تین بنیادی اجزاء کی مذہب مین کوئی یکسانیت ہے جس کی وجہ سے کسی قسم کا اتحاد وجود میں لایا جاسکتا ہے یا کسی عالمگیر مذہب کو تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ فلسفہ، کیا کوئی ایسا فلسفہ ہے جسے عالمگیر کہا جا سکتا ہے؟ ہر مذہب والے اپنے اپنے اصول پیش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ بس انہی کے اُصول درست ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ اُن کے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہبوں کا طریقہ کار ہی غلط ہے۔ بعض لوگ تو اپنے عقائد منوانے کے لئے تلوار تک سے بھی کام لیتے ہیں اور یہیں سے مذہبی تعصب یا مذہبی دیوانگی جنم لیتی ہے۔ اِس مرض سے بڑھ کر دُنیا میں اور کوئی خطرناک مرض نہیں۔ اِس کے نتیجے میں فطرت انسانی کی تمام شیطانیت اور خباثت اُبھر آتی ہے۔ غیظ و غضب کے شعلے بھڑک جاتے ہیں اور انسان انسان نہیں رہتے بلکہ درندے بن جاتے ہیں۔

دوسرا حصہ ہے دیو مالا: کوئی عالمگیر دیو مالا ہے جسے سب مذہب تسلیم کرتے ہوں۔ ہر مذہب یہی کہتا ہے کہ میری کتابیں میری حکایات محض فرضی افسانے نہیں، حقیقتیں ہیں۔ کسی بھی مذہب کا کوئی دیو مالا واقعہ لیجئے۔ دوسرے مذہب والے اس کا مضحکہ اُڑائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیا خدا فاختہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے کیا خدا کو گائے یا گھوڑے کی شکل میں پرستش کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن فاختہ کی شکل میں خدا کو تسلیم کرنے والا اپنے مثالی افسانے پر اٹل ہے۔ گھوڑے یا گائے والا اپنی جگہ۔ اس طرح دیو مالا بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ سے بھی مذہب کا کوئی عالمگیر پہلو نہیں نکل سکتا۔

اب آیئے تیسرے حصہ پر یعنی رسومات: یہاں تو بالکل توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اُس کی اپنی رسومات تو مقدس ہیں مگر دوسرے فرقے کی رسومات محض بے معنی توہمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر ایک خاص فرقہ ایک خاص علامت یا نشان (Symbul) کو اپنا معبود بناتا ہے تو دوسرے فرقے کو کوفت ہوتی ہے کراہت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مورتی پوجا لیجئے۔

مُورتی پوجا کرنے والے کو پتھر کی مورتی نہیں اپنے معبود کے

سِوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن دوسرے مذہب والے کو یہی مُورتی (اِسی مورتی میں) پتھر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

عیسائیوں کی ایک رسم ہے (Sacrament) اِس میں خود اُن کے بانی مذہب کو ذبح کر کے اُس کے پیروکار اُس کا گوشت کھاتے ہیں اور خون پیتے ہیں تا کہ اس رسم کے ادا کرنے سے اِس عظیم الشان انسان کی خوبیاں اُن کی ذات میں آجائیں۔ لیکن غیر عیسائی کیا اِسے مردم خوری کے علاوہ کچھ اور کہہ سکتے ہیں کیا؟

اسلام مساوات پر بہت زور دیتا ہے لیکن غیر مسلم مساوات کو کیا سمجھ سکتا ہے؟

ایک مسلمان کے لئے مساوات کا مطلب سماج میں نابرابری کو ختم کرنے کے مُترادف ہے اور اسی لئے مسلم سماج میں زکوٰۃ، قربانی اور خیرات کافی اہم ہے لیکن غیر مسلم اِس بہترین اُصول کو یہ رسم اقتصادی، جسمانی اور جنسی نابرابری کہہ کر خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اس طرح ابھی تک ہم نے دیکھا کہ جو چیز ایک مذہب کے پیروکاروں کو اپنے مذہب کے ساتھ جوڑتی ہے وہی چیز دوسروں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تو کیا کوئی چیز مشترکہ نہیں؟

مشترکہ ہے ضرور ہے اور وہ ہے "انسانیت" انسان کا وجود مشترکہ ہے اور یہی ایک رشتہ ہے جو ہمیں آپس میں باندھ لیتا ہے۔

بنی نوع انسان کے بنیادی تصور کی نسبت سے ہم برابر اور یکساں ہیں لیکن انفرادی طور پر ہم کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں، مرد کی حیثیت سے آپ کا وجود عورت سے مختلف ہے۔ لیکن انسانی رشتہ سے آپ میں عورت میں کوئی فرق نہیں۔ بطور انسان ہماری ہستی جانور کی ہستی سے جدا ہے لیکن ایک جاندار کی حیثیت سے ایک مرد ایک عورت، جانور، پودے، پیڑ سب یکساں ہیں، یہی نہیں بلکہ جہاں تک ہستی (Existence) کا تعلق ہے وہ احساس دُنیا کی ہر شئے میں موجود ہے۔ اسی لحاظ سے ہم ایک کائناتی ہستی کے حصہ دار ہیں۔ اور ہم سب ایک رشتہ وحدت میں منسلک ہیں۔

یہ رشتہ وحدت، یہ کائناتی ہستی یعنی خدا کے وجود کا تصور ہے۔ وہی عالم کائنات کی آخری وحدت ہے۔(Ultimate Unity)۔

مکمل یکسانیت دُنیا کے ختم ہونے پر ہی ممکن ہے۔ توازن کے بگڑ جانے سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اگر توازن قائم ہو جائے حرکت

کہاں سے ہوگی اور اگر بغرض محال یہ ممکن بھی ہو جائے تو ہمارے حق میں بڑی خطرناک ثابت ہوگی۔ جب تک عالم ظہور قائم ہے تفریق اور اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔

ہماری جسمانی اور دماغی قوتیں اسی سے متحرک ہوتی ہیں یہی ہماری زندگی کا روح رواں ہے اور ہمارے غور فکر کی جان ہے۔

اس طرح ہمیں اعتراف کرنا ہوگا کہ زندگی تفریق اور اختلاف پر مبنی ہے۔ یہ تمام فرق مٹائے نہیں جا سکتے۔ ان کو تسلیم کر کے ان کو سمجھ لینے میں ہی کامیاب زندگی کا راز ہے۔ دوسری طرف ہمارا مشاہدہ ہے کہ کثرت پر ہی زندگی کا انحصار ہے۔ اسلئے اصل کیا ہے؟ حقیقت کیا یہ سمجھنا ضروری ہے۔

اصل یہ ہے کہ حقیقت کا اظہار لاکھوں صورتوں میں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے۔ اور اِن میں سے ہر صورت اپنی جگہ سچائی پر مبنی ہے۔ ایک نئی چیز ہزاروں نقطۂ نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ہر نقطۂ نظر سے مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ بدستور اپنی شکل میں قایم ہے۔ مثال کے طور پر آفتاب کو لیجئے۔ طلوع کے وقت آفتاب ایک بڑا گولا سا نظر آتا ہے دوپہر اور شام کو اس کی صورت اور ہوتی ہے اور رات کو نظر ہی نہیں

آتا مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ بدستور قائم ہے اور پنی شکل میں قائم ہے۔

یہی حال بھگوان یا اللہ کا ہے۔ اللہ حقیقت کا سورج ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے مقام اِرتقا سے اللہ کو سمجھنے میں کوشاں ہے۔ کسی کو ایک صورت نظر آتی ہے اور دوسرے کو دوسری۔ یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ بھگوان تو دراصل ایک ہے۔ کوئی اسے بلند قسم کے فلسفے کی معرفت سمجھتا ہے تو کوئی ہزاروں من گھڑت قصوں کے ذریعہ۔

کئی مذہبوں میں پرستش کی رسمیں نفاست کی حد کو پہنچ گئیں ہیں اور کہیں ٹھوس قسم کی بُت پرستی کا رواج ہے، لیکن سب ایک ہی خُدا کو پانے کے لئے سر توڑ جدو جہد کر رہے ہیں۔

تمام مذاہب ان برتنوں کے مانند ہیں جس میں خدا کی معرفت کا آب حیات یا امرت بھرا ہوا ہے۔ جن لوگوں کو اپنی پیاس بجھانی ہو وہ جس برتن سے چاہیں لے سکتے ہیں۔ سوال پیاس کا ہے برتن کا نہیں۔

کائناتی وُسعت یا عالمگیریت کا عرفان بھی ہے کہ تمام مذاہب کے ظاہری اخلاقیات کے پس پشت ایک خدائی حقیقت کو دیکھا جائے جو لاشریک ہے۔ یکتائے واحد ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق متواتر کوشش کر رہا ہے۔ اتحاد محض

انفرادیت کے وجود کو مٹا دینے کا نام نہیں، اتحاد مختلف اجزا کو یکجا کرنے کا نام ہے۔

خدا تمام مذاہب کا مرکز ہے اور ہم میں سے ہر شخص اس مرکز تک پہنچنے کی کوشش میں ہے اس لئے اپنے مرکز تک پہنچ کر ہی ہم باہمی اختلافات کو ختم کر سکتے ہیں اور اِسی روحانی پہلو کو لیکر ظاہر اور باطن کو روشن کرنے میں کامیاب اور کامران ہو سکتے ہیں۔

سماج میں ہم کو مختلف مزاج کے آدمی ملتے ہیں، ہزاروں قسم کے دماغ اور ہزاروں قسم کے رجحانات ہوتے ہیں۔ عملی مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے اِن کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ اشخاص جو ہر وقت سرگرم اور مقید رہتے ہیں، ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں بڑے سے بڑا کام سرانجام دیں۔ انہیں لوگوں کے ہاتھوں عظیم الشان کام سرانجام پاتے ہیں۔ یہی لوگ منصوبے اور پلان تیار کر کے انہیں عملی جامہ پہناتے ہیں اور تمام منظم و تعمیر انہیں کی بدولت ظہور پرور ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو جذبات

کے تحت کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حسین چیزوں سے والہانہ محبت ہوتی ہے۔ وہ قدرت کے جمالیاتی رُخ کے شیدائی ہوتے ہیں احساس جمال سے محفوظ ہوتے ہیں اور حسن جمال کے دیوانے ہوکر عشق و محبت کی پرستش کرتے ہیں۔ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق وہ حسین سے حسین چیزوں کی متواتر تلاش کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ تیسرا طبقہ صوفیوں یعنی اہل باطن کا ہوتا ہے جن کا دِماغ خود اپنا تجزیہ نفس کرنا چاہتا ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسانی دِماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ تزکیہ نفس کی کیا کیا صورتیں ہیں اور وہ کونسی طاقتیں ہیں جو پردہ باطن میں کارفرما ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان طاقتوں کا علم کیسے پایا جاسکتا ہے اور اِنہیں استعمال میں کیسے لایا جاسکتا ہے۔

۴۔ چوتھے زمرے میں فلاسفر آتے ہیں جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ جو ہر قول کو دِماغ کی ترازو میں تول کر اپنے محبوب کو آخر کار اُس مقام پر لے آتے ہیں جہاں کسی قسم کی منطق اور فلسفے کا گذر نہیں۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر اور مکمل مذہب وہی ہوسکتا ہے جو بنی

نو انسان کے اِن تمام طبقوں کو تسکین اور آسودگی پہنچا سکے۔ اِن مختلف دِماغوں کے لئے غذا مہیا کر سکے اور ہر شخص کی طبیعت اسے قبول کر سکے۔ وہ فلسفی، عاشق اور صوفی کے لئے یکساں طور قابل قبول اور قابل عمل ہو۔ فلاسفر کے فلسفانہ معیار پر پورا اُترے۔ جذباتی لوگوں کی جمالیاتی ضرورت پورا کر سکے اور صوفیوں کے لئے تصوف اور عرفان کی مستی دامن میں لئے ہو۔ بلکہ یہی نہیں کالجوں کے پروفیسروں، سائنس دانوں اور علم طبعیات کے ماہروں کے ہر سوال کا حل مہیا کر سکے۔

اگر مذہب درحقیقت ایسا مذہب ہے تو اِس پر عمل کرنے کے دوران ایسا مقام آتا ہے جہاں منطق اور دلیل کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مذہب ہمیں وہ عملی طریقہ بتاتا ہے جس سے اِس فلسفے کا ذاتی احساس ہو جاتا ہے کہ دُنیا ایک ہی وجود کی مختلف صورتوں کا مجسمہ ہے۔

ہم اگر ایک مکمل انسان یا آدرش پُرش کی تلاش یا تعمیر کے لئے کوشاں ہیں ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے جس کی سرست میں فلسفہ جمالیات، قوت عمل اور تصور کے عناصر متوازن اور مناسب مقدار میں موجود ہوں۔ کاش تمام انسانوں میں ایسا ہوتا۔



حصول علم اور اُسکے وسائل

اس وقت ہمارا موضوع ہے "علم و مذہب"۔ اور یہ مذہب کیا ہے؟

مذہب وہ علم ہے جو انسان کو خدا تک لے جائے۔ انسان کو تلاشِ حق کے لئے آمادہ کرے۔ اور اِس مشکل معیار کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں اس کی ہمت باندھے۔

گویا مذہب وہ علم ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے اور انسانیت کو بلند کر کے خدا تک لے جاتا ہے۔ یہی علم حاصل کرنے کے لئے تین وسیلے ہیں۔

۱۔ تحریک طبعی

۲۔ عقل و دِلیل

۳۔ القایا الہام

تحریک طبعی کا تعلق جانوروں سے ہے۔ یہ وسیلہ ناکام ہوتا ہے

اسی لئے جانوروں کا دائرہ عمل بہت محدود ہوتا ہے۔ یہی تحریک طبعی بڑھکر عقل اور دلیل کی صورت اختیار کرتی ہے۔

عقل دلیل اور منطق کے قدم بھی تھوڑی ہی دُور تک اُٹھ سکتے ہیں اور ایک مقام پر رُک جاتے ہیں اور اُس وقت جو علم یا جو وسیلہ کام کرتا ہے وہ ہے الہام۔ الہام کا تعلق خدارسیدہ انسانوں سے ہے۔ یہ تینوں وسائل بیک وقت انسانکی دسترس میں ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ تحریک طبعی انسان میں بالکل مِٹ جاتی ہے۔ یا خدارسیدہ انسان عقل وخرد سے کام لینا ہی چھوڑ دیتا ہے بلکہ ہرانسان اپنے ارتقائی مقام کی نسبت سے بیشتر اِن تینوں وسیلوں کو کام میں لاتا ہے اور ہر وسیلہ دوسرے وسیلے کی ارتقائی صورت ہے۔ اس کی حد نہیں۔ تحریک طبعی بڑھ کر عقل اور دلیل کی صورت اختیار کرتی ہے اور عقل و دلیل نشو نما پا کر الہام کا مرتبہ پالیتا ہے۔

صحیح مذہبی تعلیم کی پہچان یہی ہے کہ اس سے معقولات کی مخالفت یا تردید نہیں ہوتی، دُنیا میں کامیابی کا راز اور حصول مقصد کا واحد طریقہ ہے یکسوئی۔ یکسوئی یعنی (Consentration) ایک ہی خیال کو پورے دماغ و دِل میں مرکوز کرنا۔ انسان کا میدان عمل کچھ بھی

ہو۔یکسوئی اور دھیان کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔دھن دولت ہو طبعی علم ہو یا روحانی آ گہی۔کوئی بھی چیز یکسوئی کے بغیر دسترش میں نہیں آسکتی۔ایک کیمیا گر جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے تو وہ اپنی ساری طاقتوں کو یکسو کر لیتا ہے۔

یکسوئی کی طاقت جتنی زیادہ ہوگی اُتنا ہی زیادہ علم حاصل ہو سکے گا۔علم کے خزانے کی واحد کنجی دِل اور دِماغ کی یکسوئی ہے۔ یکسوئی کے بغیر کوئی بھی کام صحیح طریقے سے انجام نہیں لایا جاسکتا۔علم الٰہی میں یکسوئی کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اِس علم میں رُوح انسان کو رُوح عظیم کے ساتھ ملانے کے لئے باہری واندرونی سوچ اور عمل کو یکسو کر کے ہی نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے۔

روح انسان اور روح عظیم کو ملانے کی سائنس کا نام ہے ''یوگ''یعنی جوڑ متحد ہونا۔ملاپ،اتصال۔

۱۔ اپنی ذات اور خدائے محبت کا باہمی اتصال۔

۲۔ رُوح انسان اور رُوح عظیم کا اتصال۔

۳۔ ہر انسان اور تمام طبقہ انسانیت کا اتصال۔تمام موجودات کا باہمی اتصال۔

آیئے ہم اس اتصال یعنی یوگ کے مختلف پہلوؤں اور طریقوں پر غور کریں۔

اس سے قبل کہ ہم ایسا کریں پہلے یوگ کے متعلق تھوڑی سی وضاحت ہو۔

یوگ کسی خاص مذہب یا فرقے کی جاگیر نہیں، بلکہ انسان کی روح کو روحِ عظیم کے ساتھ ملانے کی سائنس ہے۔ یوگ کا جادوٹونے یا بازی گری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

یوگ کا اصول ہے جو کچھ آپ کی سمجھ میں آئے اُس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ اور جس چیز کو آپ کی عقل قبول نہ کرے ایسی چیزوں کا ترک۔

یوگ کے چار طریقے ہیں۔

۱۔ کرم یوگ ۲۔ گیان یوگ

۳۔ بھگتی یوگ ۴۔ راج یوگ

ہم میں ہر انسان اپنی طبیعت اور رجحان کے مطابق اپنے لئے کوئی بھی ایک راستہ خود منتخب کر سکتا ہے۔

صرف اِن اصولوں کو جان لینے سے کام نہیں چلتا بلکہ اِن

اُصولوں کو عملی جامہ پہنائے بغیر روحانیت کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔

مذہب اور رُوحانیت کی راہِ عمل میں صرف سننے سنانے سے کام نہیں چلتا۔ یہاں سوال ہے زندگی کا رُخ بدل دینے کا، خودی سے خدا بننے کا یا بنانے کا۔ آیئے ہم سب اِس شاہراہ عمل پر گامزن ہو جائیں۔ "عمل ہی مذہب ہے" باقی سب باتیں ہی باتیں۔

یوگ کے اِن چار طریقوں کی تھوڑی سی وضاحت یہان کرنا بھی ٹھیک ہوگا۔ تفصیلی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔



کرم یوگ

کرم یوگ خدا سے جوڑ لگانے کا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ کام کرنے کے اصل راز اور طریقہ کو جان سکتے ہیں۔

عمل کے ذریعہ اور صحیح طریقے سے کام سرانجام دیکر خدا تک پہنچنے کی سائنس کا نام ہے ''کرم یوگ''۔ کرم یوگ ہمیں بتا تا ہے کہ کیا کام کہاں کرنا ہے اور کیونکر کرنا ہے اور کس طرح اپنی طاقت اور اپنی صلاحیت کو اپنے کام میں لگا کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ کام محض کام کی غرض سے کرنا چاہیئے اور ہمارے کام میں کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہونا چاہیئے۔ بے لوث کام کو خدا کی عبادت سمجھ کر خدمت خلق کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔

خدمت خلق کے لئے کام کرنے والے کو کرم یوگی کہتے ہیں۔

کرم یوگی کام اسلیئے کرتا ہے کہ کام کرنا اُس کی فطرت کا جزو بن گیا ہے۔ وہ اپنے کام سے خدا اور خدا کی مخلوق کے بھینٹ چڑھا کر

راہِ عمل میں کچھ دینا چاہتا ہے۔ لینے کا خیال یعنی معاوضہ کا خیال ہی اُس کے دِل میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح اُس کے عمل کا ردِ عمل اُس پر دُکھ درد اور تکلیف کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ رنج وغم، دُکھ اور تکلیف انسان پر اُسی حالت میں نازل ہوتے ہیں جب اُس کے دِل میں اُمید وبیم۔ یا لالچ یا خودغرض کے جذبات ہوتے ہیں۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش اور اُس کے نہ ملنے کا خوف یا رنج وغم، دُکھ و تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ جس کے عمل میں اِن کا اثر اور خوف نہ ہو اُس میں دُکھ درد کا گذر ہی نہیں ہوسکتا۔



گیان یوگ

فلاسفر یا مفکر یا گیان یوگی وہ ہے جو عالم مشہور کی حدود سے آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ ہزاروں علم حاصل کرنے پر بھی اُس کی سیری ممکن نہیں۔ اُس کی رُوح اِس دُنیائے آب وگل کے قادر قلب کے وُجود کے اندر سرائیت کرنا چاہتی ہے۔ وہ حقیقت کو اُس کی اصلی صورت میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہوتا ہے وہ حقیقت کا انکشاف اور احساس اپنی ذات میں کرنا چاہتا ہے۔ ''من وتو'' کا فرق مٹا کر وحدت الوجود کا احساس بن جانا چاہتا ہے۔ ایسے یوگی کی یہ پیاس اُس وقت بجھی ہے جب اُس کی رُوح۔ رُوح عظیم سے ایک ہوجاتی ہے۔ اُس کی رُوح رُوح پاک سے واصل ہوجاتی ہے۔ خود اس کی ذات ہی خدا ہو جاتی ہے۔

اُس کی ہستی کے تمام فانی اجزاء فلسفہ اور گیان کی قرب سے پاش پاش ہو کر کالعدم ہوجاتے ہیں اور باقی خود خدا کی ذات رہ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں رُوح کا رُخ خدا کی نامعلوم ہستی کی طرف ہو جاتا

ہے۔اُسے محسوس ہوتا ہے کہ گرد پیش نور کا ایک سیلاب اُمڈ رہا ہے۔

اور آہستہ آہستہ اُس کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔جس کے نور سے کائنات کے بے شمار سورج اور چاند روشن ہیں۔جس کی چمک ذرّے ذرّے میں بس رہی ہے۔

انسان کی ہستی بنیادی طور پر ربانی ہستی ہے حقیقت بس ایک ہے۔خدا اور بندے کی دو علیحدہ علیحدہ ہستیاں نہیں۔ہم میں بذات خود وہ رب مطلق وہ پرماتما ہے جس کا ظہور صفۂ ارض پر ہو رہا ہے۔ہمارے پاؤں تلے رینگنے والے ادنیٰ کیڑے سے لیکر بلند پایہ ہستیوں تک جن کے رعب جمال کے سامنے جن کی شان شوکت اور عظمت کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتے۔میں بھی اُسی ایک ایشور یا اللہ کا جلوہ پذیر ہوں،زندگی واحدالوجود ہے۔

یہ ہے گیان یوگ کا فلسفہ: فلاسفر ایک نایاب اور خوبصورت مجسمے کا یہ دیکھنے کے لئے توڑتا ہے کہ وہ جان سکے کہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔وہ حقیقت کو ننگا اپنی آنکھوں سے اور اپنے دِل و دِماغ سے دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہے۔

بھگتی یوگ

جذباتی لوگ عاشق عشق و محبت کے جذبات کو مجسم صورت دیکر محبوب حقیقی کے قدموں پر پیش کرتے ہیں۔ پوجا پاٹھ کے مختلف رسموں سے کام لیتے ہیں، پھول اور خوشبوؤں کی بھینٹ چڑھا کر خوبصورت پرستش گائیں بنا کر۔ مقدس مقامات کی زیارت کر کے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں اور تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ مندر، مسجد، گرجے جہاں کہیں بھی اُسے اپنے محبوب کا کوئی نشان مل جاتا ہے اُس کا سر سجدے میں جھک جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی تمام قوتوں کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کی بڑی بڑی روحانی ہستیاں وہیں پیدا ہوتی ہیں جہاں مذہبی رسوم و روایت و دیو مالا کی بہتات رہی ہے۔ جس مذہب میں انسانی محبت اور جمالیاتی تصورات کا سامان موجود ہے اُسی کے دامن میں وقتاً فوقتاً عظیم الشان رُوحانی ہستیاں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ دُنیا کے بڑے بڑے روحانی مشاہیر نے اُن ہی مذہبی فرقوں میں جنم لیا ہے جن کے پاس دیو مالا اور پوجا پاٹھ کے رسموں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ اور جس مذہب نے کسی نشان یا

پوجا پاٹھ اور عبادت کے رسموں کے بغیر پرستش کرنا چاہی ہے وہ ایک نہایت ہی خشک قسم کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اور اُس نے انسان کے حسین و بلند خیالات کو نہایت بیدردی کے ساتھ تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

انسانی دماغ پر رسم رواج کی پابندی اور دیو مالا پر اعتماد سے بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ حسن فطرت کے راز اُن ذرائع سے پا سکتا ہے۔ اور اُن کی ہی مدد سے نغمات الہام کی مسرتوں کا لطف بھی اُٹھا لیتا ہے۔

نشاطِ رُوح کی شراب سے وہ سرشار ہو جاتا ہے۔ خدا کی ہستی اُس کی نگاہ میں ایک ایسی ہستی ہے جسے وہ محسوس کرتا ہے اور حقیقی سمجھ کر وہ اپنے محبوب کو مجسم بنا کر اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ہاتھوں سے چھو لیتا ہے اور اپنی محبت کا تمام خزانہ اُس کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔

بھگتی یوگ جذبات پرست لوگوں کو محبوبِ حقیقی سے بے غرضانہ محبت کرنا سکھاتا ہے۔

بھگتی یوگ کی تعلیم یہ ہے کہ بھگت جس نام سے چاہے بھگوان کو پکارے۔ اُس سے سچا پریم کرے۔ جس صفت سے چاہے اُس سے

متاشف کرے۔ اُس سے محبت کرے اُسے خالق قرار دے۔ حاضر کُل کہے۔ ناظر کُل کے نام سے موسوم کرے۔ باپ کہے، ماں کہے۔

محبت کا اظہار جہاں کہیں بھی اور جس کسی بھی صورت میں ہو۔ خدا کے وجود کا اظہار ہوتا ہے۔

مسلک عشق اور محبت کی انتہا کا نام بھگتی یوگ ہے۔



راج یوگ

دُنیا کی دوسری سائنسوں کی طرح راج یوگ بھی ایک معتبر سائنس ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری سائنس مادی مشاہدات پر مبنی ہے اور راج یوگ انسان کے باطن عالم کے واقعات کی تشریح اور ترتیب کرتا ہے۔

یہ ہماری زندگی کی بُنیادی سائنس ہے۔اور یہ علم ہمیں روحانی عالم تک جانے کا راستہ دِکھاتا ہے۔

راج یوگ دِماغ کی حدود سے گذر کر شعور کی وسعتوں میں جانے کا علم ہے۔اس کے عمل سے ہمارے شعور کے نئے نئے رُخ آشکارہ ہوجاتے ہیں۔لاعلمی اور جہالت کے پردے یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں اور ہمارے تہہ پستہ دِماغ کی نسیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ایک نئی زندگی کے نئے واقعات اور نئی حقیقتوں کا انکشاف ہو رہا ہے اور نئی نئی قوتیں ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔

راج یوگ کے عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔

۱۔ ترک

۲۔ آرزو

۳۔ ریاضت یا عمل

ترک

اس دُنیا اور عقبٰی میں عیش وطرب و مکمل لذات کے تمام خیالات کا ترک اور صرف خدا یا بھگوان سے دِلی لگاؤ۔ ہم دُنیا میں معرفت حق کے لئے آئے ہیں لذتیں پانے کے لئے نہیں۔ لذتیں حیوانوں کے لئے چھوڑ دو۔ انسان کا وجود مقوی غور وفکر کے لئے بنا ہے اور ہمیں اُس وقت تک جد وجہد کرنی چاہئے جب تک موت کو مسخر نہ کرے۔ انسان کی نظر حق وصداقت کی روشنی کو دیکھنے کے لئے بنی ہے

جسمانی احساسات کے اندھیرے سے نکلنا ہی ہمارا مقصد حیات ہے ہمیں اپنی سب کوششیں اسی مقصد کے لئے مخصوص کردینی چاہئے۔

آرزو

ترک خواہشات بذاتِ خود کافی نہیں۔اس کے ساتھ انسان کو اپنے دِل میں معرفت حق اور معرفت رَب کی بے پناہ آرزو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔خدا کو پانے کے لئے بے تاب اور بے قرار ہو جانا ضروری ہے۔جس طرح ایک ڈوبتا ہوا آدمی سانس لینے کے لئے بے تاب اور بے قرار ہو کر تڑپتا ہے۔چھٹ پٹاتا ہے۔اِسی طرح کی چاہت بھگوان یا اللہ کو پانے کے لئے ہونی چاہئے۔

ریاضت یا عمل

راج یوگ میں جہاں ترک اور آرزو ضروری اور اہم ہیں۔ ریاضت اِس تلاش کی تکمیل اور اس سفر کی منزل ہے۔عمل ہی تو مذہب کی جان ہے باقی سب باتیں ہی باتیں۔

ریاضتیں چھ(6) ہیں:

۱۔ ضبط دِماغ: مَن کو اِدھر اُدھر جانے سے روکنا۔

۲۔ ضبط حس: حواس کو آوارہ بھٹکنے سے روکنا۔

۳۔ دِماغ: (من) مَن کو بطون یا باطل کی جانب مائل کرنا۔

۴۔ بغیر شکوہ وشکایت کے زندگی کے ہر واقعہ کو قبول کرنا۔

۵۔ دِماغ کو ایک ہی خیال پر مرکوز کرنا۔ یہاں تک کہ وقت کا احساس بھی باقی نہ رہے۔

۶۔ اپنی اصلی فطرت یعنی اپنی روحانی حقیقت پر بار بار اور مسلسل غور کرنا۔ دوسرے الفاظ میں ریاضت کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اپنے دِماغ اور حواس کو اپنے قابو میں رکھ کر اور یکسو کر کے اپنی داخلی حقیقت پر مرکوز کرنا۔ جسمانی انفرادیت کے وہم سے چھٹکارہ اور اپنی کمتری اور فرد مائیگی کے خیال کے طلسم کو توڑنا۔ ہمیں محسوس کرنا ہے کہ ہماری اصل کیا ہے اور ہم خدا سے واصل ہو گئے ہیں۔ اس ضبط و نظم کی پابندی کے بغیر کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں رُوحانیت کے چار راستے۔



اوتار یا پیغمبر

خدا کرے کہ ہمارا دِماغ اُس مقام تک ترقی کر جائے جہاں ہمیں زندگی کے ابدی اُصول سمجھنے کے لئے مجسم مثال کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن ابھی تک ہم اُس مقام سے دُور ہیں یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کی اکثریت ہمیشہ پیغمبروں اوراوتاروں کی عظیم ہستیوں کے قدموں میں سر جھکائے رکھتی ہے۔

پیغمبر اور اَوتار دُنیا کے عظیم ترین مفکر ہیں جو ایک نئی فکر اور نئی نظر پیدا کرتے ہیں اور زندگی کو ازسرنو تازگی اور توانائی بخشتے ہیں۔ اُن کی بلند مرتبہ ہستی سے قوم کو تازہ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ پیغمبر اور اَوتار اپنے وقت اور ماحول کے موافق پیدا ہوتے ہیں اور اُس قومی مہر کا جزو ہو جاتے ہیں جو اُس وقت اُٹھ رہی ہوتی ہے۔ وہ قومی زندگی کی اُس لہر کو متحرک کر کے اُسے عروج پر لے جاتے ہیں۔ اُن کی بے حساب

طاقت کا اثر اور عمل سماج پر ہوتا ہے۔

دُنیا کے مذہبی رہنماؤں اور پیغمبروں و اوتاروں کی زندگی کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک اپنا مخصوص پیغام لے کر ایک مخصوص کام کرنے آیا تھا۔

یہ سب اپنی اپنی جگہ کامل تھے اور ہر ایک کی حقیقت راگ کی نہیں بلکہ سُر کی سی تھی۔ زندگی کی نغمگی اُن سب سُروں کو ملا کر بنتی ہے۔ جسطرح مختلف فرقوں اور قوموں سے مل کر نسل انسانی کا مجموعی شعور اور راگ پیدا ہوتا ہے۔ اُسی طرح زندگی کی نغمگی مختلف مذہبوں سے مل کر بنتی ہے۔

دُنیا ہمیشہ اُس پیغمبر اور اوتار کی ممنون رہے گی جو تہذیب انسانی کی تشکیل اور روحانی ارتقاء کی تکمیل کے لئے اپنی اپنی مخصوص نعمت عطا کر جاتے ہیں۔

ہم میں سے بیشتر لوگ کسی خاص مذہبی رہنما پر ایمان لانے کو ہی مذہب سمجھتے ہیں۔ لیکن ہر ایسے رہنما نے ایک ایسی منزل کی نشاندہی کی ہے جو لازوال ہے اور بے مثال ہے اور اُسی لئے اُن کی گواہی سے عام انسان خدا کے وجود کو محسوس کرنے لگتا ہے۔

اوتار یا پیغمبر اور عام انسان میں فرق کیا ہے؟

پیغمبر اپنی آنکھوں سے خدا کو جلوہ دیکھ کر اُس کی ہستی کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور عام انسان منطق اور دلیل کے ذریعہ خدا کو سمجھتے ہیں اور سمجھنے کے بعد بھی اُس کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ پیغمبر یا اوتار نہ صرف حق و صداقت کو اپنے سامنے جلوہ گر دیکھتے ہیں بلکہ جسے چاہے اُسے اُسکے جلوہ سے فیضیاب کرا سکتے ہیں۔ ہمیں خدا کو ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن پیغمبر یا اوتار اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لیتے ہیں اور دوسرے کو بھی دِکھا سکتے ہیں۔ اُس کا ثبوت مہیا کر سکتے ہیں۔

پیغمبر یا اوتار کی تمام کائنات پر حکومت ہوتی ہے اور وہ ایک مِشن لے کر آتے ہیں۔ اُن کی خود اعتمادی اور ایمان و یقین کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہماری ساری کائنات پر اُن کا اثر رہتا ہے۔ دُنیا اُنہیں سُنے بغیر نہیں رہ سکتی وہ جو کچھ کہتے ہیں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ اُن کا ہر لفظ دِل سے نکلتا ہے اور اُس میں اتنی کشش اور طاقت ہوتی ہے کہ دُنیا اُس کی تاب نہیں لا سکتی، اُن کی خاموشی سے بھی صداقت برستی ہے۔ وہ بغیر الفاظ کی وساطت کے اپنے دِماغ سے دوسرے کے دِماغ تک براہِ

راست روحانی مطلب پہنچاتے ہیں۔ وہ روحانیت کی نعمت لے کرآتے ہیں اور اِس بے بہا دولت سے سب کو مالا مال کردیتے ہیں۔

پیغمبر یا اوتار بذات خود خدا کا زندہ مجسمہ ہے۔ حقیقت مجاز کی صورت اختیار کرتی ہے تو اوتار یا پیغمبر زمین پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ روحانی ہستیاں جو وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور یہ سب ایک ہی حقیقت کا پیغام لیکر آتی رہی ہیں۔ کسی نے اس حقیقت کے ایک پہلو پر زور دیا ہے اور کسی نے دوسرے پہلو پر۔ مگر بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ کوئی اختلاف نہیں۔ اُن کی تعلیم واُن کے ارشادات رُوحانی اِرتقاء کے لئے ہیں۔ مذہبی تعصب کے لئے نہیں۔ مذہب نے کسی کو آج تک کسی پر ظلم ڈھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور نہ ہی ایسے خیالوں کو گوارہ کیا ہے۔ اگر لوگوں کو شیطانی حرکتوں کے لئے اُکسایا گیا ہے تو وہ سیاست کی وجہ سے نہ کہ مذہب کی وجہ سے۔ شیطان فرشتے کے بھیس میں اگر شیطانی کرے تو اِس میں فرشتوں پر کیا الزام عاید کیا جاسکتا ہے۔

مذہب اور رُوحانیت جو پیغمبر یا اوتار کے ذریعہ دُنیا میں نشو نما پاتے ہیں اُس احساس لطیف کا نام ہے جو دِل کی گہرائیوں سے اُٹھتا

ہے جس کی بدولت انسان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اپنے ہاتھوں سے چھو رہا ہے۔

آج کل کے انسان کی یہ کس قدر خوش قسمتی ہے کہ اُسے متعدد سنہری اُصول اوتاروں اور پیغمبروں سے وراثت میں ملے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی زندگی میں تبرک اور تقدس بھر سکتا ہے۔ اگر ہمیں انسانی تہذیب کی معراج کو پانا ہے تو ہمیں اصولاً اور عملاً سب اوتاروں اور پیغمبروں کا اپنانا ہوگا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اُن کے اُصولوں کو اکھٹا کریں اور اُن پر عمل کر کے آگہی اور عرفان کے اُس مقام تک پہنچ جائیں جہاں نہ صرف اِن اُصولوں کی حقیقت ہماری ہستی میں مجسم ہو جائے بلکہ اگر ضرورت ہو تو ہم اُن میں اضافہ بھی کریں۔

اگر پیغمبروں اور اوتاروں کو خدا کی قربت حاصل ہے تو ہم بھی اپنے کمال کو پہنچ سکتے ہیں۔ ہم بھی یزدانی طاقت سے بھر پور ہیں۔ ہماری خودی مین بھی خدا کا ظہور ہے۔ ہمیں بھی وہ مقام حاصل کرنے کا حق ہے جہاں خدا کی قربت میں ''من وتو'' کا فاصلہ مٹ جاتا ہے، جہاں ہمارا احساس خودی احساس خدا بن سکتا ہے۔

تمام مذاہب میں اپنے اوتاروں یا پیغمبروں کی قدر اُن کی

شخصیت اور کردار کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

مذہب ویدانت میں اوتاروں کی قدر اس لئے ہوتی ہے کہ وہ ویدوں کے اُصولوں کی عملی مثال ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ویدانت کے بغیر دوسرے مذاہب کی بنیاد اُن کے بانیوں کی زندگی، نظریات، تعلیمات اور حکایات ہیں، جبکہ ویدانت کی بنیاد کائناتی اُصولوں پر قائم ہے ۔ کسی مہاتما اور اوتاروں کی شخصیت پر نہیں۔ ویدانت کے علاوہ ہر مذہب کی عمارت تواریخی کرداروں پر تیار ہوئی ہے۔ ویدوں کی تخلیق کسی شخص کے ہاتھوں نہیں ہوئی ہے۔ وید اُن دوامی اُصولوں کا مجموعہ ہے جنہیں رشیوں اور منیوں نے دریافت کیا ہے اور عموماً ہمیں اُن کے نام تک معلوم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دوسرے مذہب کے بانی کی ہستی کو توریخی شہادت ہ میسر نہ آئے تو اُس کو صدمہ پہنچتا ہے، لیکن اس کے برعکس ویدانت کو اوتاروں اور مہاتماؤں کے متعلق تاریخی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اِن اُصولوں کو سینکڑوں اوتاروں اور مہاتماؤں نے اپنی زندگی میں مجسم کر دِکھایا ہے۔ اور اب بھی کیا سکتا ہے۔

گیان اور گیانی

یوگ کا مطلب ہے جوڑ، بندے اور خدا کا جوڑ، گیان یوگ کا بھی وہی مقصد ہے جو بھگتی یوگ کا یا راج یوگ کا ہے۔ لیکن طریقۂ عمل مختلف ہے بھگتی کی راہ پر چلنے والے پریم اور بھگتی سے بھگوان کو پا لیتے ہیں اور راج یوگی اپنی پوشیدہ طاقتوں سے کام لیکر وجود اعلیٰ سے واصل ہو جاتے ہیں گیان یوگ اُن لوگوں کے لئے ہے جو نہ تصوف کی طرف مائل ہیں اور نہ بھگتی کی طرف بلکہ جو عقلیت (عقل سے کام لیتے ہیں پسند ہیں۔ گیان یوگی پرماتما کی حقیقت کو عقل اور منطق کی طاقت سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کی عقل سلیم جس چیز کو نہیں مانتی اُسے ترک کرنے کے لئے اُنہیں ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے پرانے عقیدہ ہو یا توہمات سب کو خیر آباد کہنا پڑتا ہے صرف ایک عزم کی بدولت وہ تمام بندشوں اور مجبوریوں سے مکمل آزادی (مکتی) حاصل کر

سکتے ہیں۔

گیان یعنی حقیقی علم کے بغیر مکتی (آزادی) نہیں مل سکتی۔ گیان یہ حقیقی علم کیا ہے؟ اسے جان لینا ضروری ہے اور یہی واقفیت ہی یا یہی گیان حاصل کرنا ہی مکتی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم محض جسم نہیں رُوح ہیں۔ لازوال اور لافانی جو کبھی مرتا نہیں اس لئے ہمارا اعلیٰ ترین گیان اس معرفت یعنی رُوح کی حقیقت کو پہچاننا ہی ہوسکتا ہے۔

ویدانت کا نچوڑ یا عطر یہ ہے کہ ہستی صرف ایک ہے اور ہر رُوح میں وہی بھرپور وجود ہے اُس وجود کا محض خبر و نہیں۔ شبنم کے چھوٹے چھوٹے قطروں میں سورج کا عکس مکمل ہوتا ہے صرف کسی خاص حصے کا نہیں۔ زمان و مکان اور تمام حوادث کائنات میں وہی ایک ہستی جلوہ گر ہے جو انسان میں ہے اور اس طرح تمام ظاہری صورتوں کے پس پردہ بس ایک ہی حقیقت ہے۔ اگر ہماری کوئی ہستی ہے تو وہ برہم یا خدا کی ہستی ہے۔ کائنات کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے سچا گیان اپنی حقیقت جو کہ برہم ہے یا جس کے پس پردہ برہم ہے جان لینا ہے۔

ویدوں کی تو مسلسل یہی تعلیم ہے کہ خدا اور انسان، پرماتما اور

آتما، رُوح اور رُوحِ عظیم، غیب اور شہود در اصل ایک ہیں۔ اور اس طرح حجابات نظر کو چاک کر کے اس حقیقت تک پہنچ پانے کا نام ہی سچا گیان یا معرفت ہے۔ اور سچا گیانی ہی اس وحدت الوجود کا احساس اور ادراک کر سکتا ہے۔

اس مقام اور منزل پر پہنچنے کے لئے کیا طریقہ ہے؟

سب سے پہلا قدم ہے ڈر سے چھٹکارہ پانا یعنی ڈر کا ترک، ڈر کا شمار ہمارے بدترین دشمنوں میں ہے۔

دوسری ضروری بات ہے اس معاملے میں محض عقیدوں سے کام نہیں چلتا۔ اس میں جب تک کسی چیز کا پورا ذاتی علم نہ ہو جائے یقین کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں یقین ذاتی تجربے کا دوسرا نام ہے۔ کسی کی کہی سُنی بات کو مان لینا یقین نہیں وہم ہے۔ اسطرح جب آپ اس چیز کو ترک کر دیں گے جس کے دوامی وجود کو آپ کی عقل تسلیم نہیں کرتی اُسی حالت میں سچی آتما۔ حقیقی خودی کا احساس اور ادراک ممکن ہو سکے گا۔

آپ اپنے آپ سے بار بار کہئے کہ میں جسم نہیں ہوں۔ جسم تو فانی ہے۔ میں دِماغ یا من نہیں، شعور نہیں ایک آتما ہوں روح ہوں اور

اس طرح صرف آتما کا احساس بیدار کریئے۔ اور جب آتما کا ہی واحد احساس باقی رہ جائے گا سب چیزیں اسی میں سمو جائیں گی۔

گیانی کا اندازِ فکر دو قسم کا ہوتا ہے۔

ا۔ ہر اُس چیز سے انکار جس سے ہماری حقیقت ہمارے احساس ہستی کی تائید نہیں ہوتی اور اُس حقیقت کے وجود پر اِصرار جو ہماری اصل ہے۔ اس طرح جسم جو کہ فانی ہے اُس کے خیال کا ترک اور آتما جو کہ لازوال ہے اُس کی ہستی کا خیال کو اُجاگر کرنا ہی گیانی کا اندازِ فکر ہونا چاہئے۔ اپنے آتما کا احساس اور نشاط ہستی ایک ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو مادّی دُنیا سے الگ کر لینا اور مادّی وجود یہاں تک کہ اپنے جسم کو حقیقی نہ سمجھنا ہی دراصل گیان ہے یا علم ہے۔ قرآن شریف میں بھی لفظ اُوم کے معنی اُس وجود کو بتایا گیا ہے جس میں سے ہر ایک شے نکلی ہو۔ یعنی اُوم درحقیقت وہ اصل ہے جس سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے اور تمام دینی فلسفہ کو ''اُوم تت ست'' (اُوم ہی حق ہے) کے تین لفظوں میں بند کر دیا ہے۔ گیانی کو اُوم تت ست کا خیال ہمیشہ اپنے دِل و دِماغ میں محفوظ رکھنا چاہئے۔ اُوم ہی اصل وجود اور اصل حقیقت ہے۔ ''گیان'' یوگ کی بنیاد خیال وحدت ہے اور

اُسے ''ادویت واد'' کہتے ہیں۔ یہاں دُوئی یعنی دویت واد کی گنجائش نہیں۔ یہ فلسفہ ویدانت کا بنیادی پتھر ہے۔ اس کا اوّل و آخر ابتدا و انتہا صرف ''برہمہ'' ہی سچ ہے۔ برہم کے سِوا اور کچھ بھی نہیں اور وہ ''برہم'' میں ہوں۔

یہ ہے حقیقت کا راز یعنی گیان جیسے ہمیں صرف جاننا ہی نہیں پانا بھی ہے۔ اور اس کا واحد طریقہ ہے کہ ہم بار بار اپنے آپ کو یہ جتاتے رہیں کہ خود ہمارا معنوی وجود ہی حقیقت ہے۔ خود ہم برہمہ ہیں یہاں تک کہ یہ خیال ہمارے وجود کا جزو بن جائے بلکہ ہماری زندگی اسی میں ڈھل جائے۔ اس بلند مقام کو ''اہم برہم'' یا انا الحق کہتے ہیں یہاں تک پہنچنے کے لئے یوگی کو جان کی بازی لگا دینی پڑتی ہے۔ اس کا کارگاہ عمل آکاش کی طرح کشادہ اور وسیع ہونا چاہیئے۔ گیان یوگی کو اپنے پر مکمل اعتماد اور قابو ہونا چاہیئے وہ جس دینی خیال یا مذہبی فلسفہ کو سمجھنا چاہیئے اُس میں اپنے آپ کو عملاً ڈھال دے۔ دوسرے لفظوں میں گیان یوگی کے دِل و دِماغ میں وسعت اور کشادگی ہونی چاہیئے۔

ویدوں کے خیال میں سب سے بڑی تین نعمتیں ہیں جو ہمیں خدا سے مِل اور ملا سکتی ہیں۔

۱۔ انسان کا قالب (بشریر)

۲۔ وصل الٰہی کی خواہش (پربھولگن)

۳۔ کامل مُرشد (گورو) جو ہمیں یزدانی نور کی طرف لے جائے جو ہمیں علم معرفت بھی عطا کرے اور نیک عمل کی راہ بھی دِکھائے۔ اگر کسی خوش نصیب کو یہ تینوں نعمتیں حاصل ہو جائیں تو سمجھ لو کہ اُسے نجات ملنے میں دیر نہیں۔

سچی آزادی سچے گیان سے ہاتھ آتی ہے۔ خواہش ہمیں اپنا غلام بنالیتی ہے۔ نفس ہمارا ایسا ظالم ہے جس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اور جو اپنے مظلوم شکار کو ایک لحہ بھی چین نہیں لینے دیتا۔ لیکن عارف (جیون مکت) تمام خواہشوں پر فتح پالیتا ہے کیونکہ جب وہ انا الحق کے مفہوم کو سمجھ لیتا ہے اور جب ہر طرف اُسے حقیقت واحد نظر آتی ہے تو اُس کے دِماغ میں کوئی خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ لیکن وحدت الوجود کا یہ احساس قائم رکھنے کے لئے ہمیں لگاتار کوشش کرنا ہوگی۔ ہمارا من ہمیشہ ہمیں فریب میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔ جب ہم اپنے آپ کو محض جسم سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ہم کئی قسم کی خواہشات میں جکڑ جاتے ہیں۔ کبھی جنسی خواہشات، کبھی مشرب وملت، کبھی ذات پات اور کبھی قوم ونسل کے

تفرقات میں پھنس جاتے ہیں۔

احساس خودی متواتر کوشش سے ملتا ہے اور اسی متواتر کوشش کو ''ریاضت'' کہتے ہیں۔ ریاضت سے یوگ حاصل ہوتا ہے۔ یوگ سے معرفت ملتی ہے اور معرفت سے سچا پریم ملتا ہے اور پریم سے نشاطِ رُوح، دائمی اور ابدی سکون کی دولت میسر آتی ہے جس کا نام خدا یا بھگوان ہے اور جسے نروان یا مکتی بھی کہہ سکتے ہیں۔

مذہب یا روحانیت اُترے ہوئے اُداس چہروں کا نام نہیں۔ محض ترک دُنیا یا رہبانیت سے تقدس نہیں آجاتا۔ اگر واقعی رُوحانیت دُنیا کی بہترین چیز ہے تو اِسے سب سے زیادہ مسرت آفرین بھی ہونا چاہیئے۔ رُوحانیت کے طالب کو ہشاش رہنا چاہیئے۔ بھلا جو آدمی پرماتما سے پریم کرتا ہے۔ جو پاک اور پوتر ہے۔ جس کے دِل صدق وصفا سے بھرپور ہے وہ غمزدہ ہو ہی کیوں؟۔ آخر اُسے کتنی بات کا رنج ہو سکتا ہے۔ اُسے تو ایک بچے کی طرح خوش رہنا چاہیئے جیسے کہ وہ بھگوان کا سچ مچ بالک ہے۔ رُوحانی اِرتقا کے لئے معرفت پانے کے لئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ تزکیۂ قلب کیا جائے۔

خدا کو حاضر و ناظر ماننے کے یہی معنیٰ ہیں کہ پہلے تو ہر شے کے

ساتھ اُس کا تعلق جوڑ لیا جائے اور پھر اُسے آشکارہ ہونے پر مجبور کیا جائے۔ دُنیاوی تعلقات میں ہمیں یزدانی جھلک دیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ سچا گیانی کسی مخصوص کیش یا طریق کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ سچے گیانی کے لئے جسم کی موت سے اُس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موت رُوح کی نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہو سکتی ہے۔ رُوح ایک دائرہ ہے جس کا محیط لا پید ہے۔ لیکن اس دائرے کا مرکز جسم میں چھپا ہے۔ جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں اُس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس لامحدود دائرے کے مرکز میں تبدیلی ہو گئی ہے۔ جب ہم اس مرکز سے اپنے محیط کی طرف بڑھتے ہوئے جسم کی تنگ قبا سے نکل جاتے ہیں تو اپنی سچی خودی کو پا لیتے ہیں۔ یہی وصل الٰہی ہے۔

حال ماضی اور مستقبل یہ تینوں زمانے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ بات کچھ معقول نہیں کہ ہم حال پر ہی دھیان دیں۔ اسی کی فکر کریں۔ ایسا کرنا اپنی فکر و نظر کو تنگ و قید کرنے کے برابر ہے۔ ماضی اور مستقبل سے الگ حال کا کوئی وجود نہیں۔ وقت ایک مکمل کُل ہے۔ جس میں یہ تینوں زمانے ماضی حال اور مستقبل شامل ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو جنم سے پہلے اور موت کے بعد کی صورتوں سے الگ کر

کے پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ زمانے اور وقت کا تصور جب تک محدود رہیگا ہمیں زندگی کا پورا ادراک نہیں ہو سکتا۔ جتنی محدود ہماری فکر و نظر ہوگی اُتنا ہی محدود وقت کا تصور ہوگا۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی حقیقت کی خاطر ان حدوں سے باہر قدم نکالیں۔

گیان یوگ ہمیں دُنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ کنارہ کشی ترک دُنیا کے مترادف نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان دُنیا میں تو رہے لیکن دُنیا کا ہو کر نہ رہے۔ دُنیا سے کنارہ کشی کا خیال تو تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔ گیان یوگ جس کنارہ کشی کی تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم تعلقات ترک کردیں۔ اپنے مشاہدہ و فکر و خیال میں دُنیا کے بجائے خدا کو جگہ دیں۔ اور جب ایسا ہو جاتا ہے من و تو کا فرق مِٹ جاتا ہے۔ ہماری نظروں اور ہمارے فکر و خیال میں بس "تُو" ہی رہ جاتا ہے تو ہم وحدت الوجود کے صحیح مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں اور یہی وحدت الوجود کا احساس ہی وصل الٰہی ہے۔ جب تک ہم خدا سے دُور رہیں گے۔ خدا کو اپنے سے دُور رکھیں گے یا خدا کو اپنے سے الگ سمجھیں گے، تب تک کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ اس خوف کو اپنے سے دُور کیجئے کہ خدا کی کوئی علیحدہ ہستی

ہے اگر میری ہستی ہے تو خدا کی ہستی ہے۔

گیانی اپنی قوت ارادی کے بل سے شریر (جسم) اور من (دِل) کی حدوں سے بھی اُوپر اُٹھ جاتا ہے اور اس عالم شہود کو صفر بنا کر رکھ دیتا ہے اور حقیقی خودی یعنی آتم گیان پالیتا ہے۔ وہ تو بس اپنی خودی کے شعور واحساس کو اپنائے رہتا ہے اور اپنی زبردست قوت ارادی سے کام لیکر دِل و دِماغ کو روحانیت کی اعلیٰ قدروں کی منزل پر لے جا کر تسکین قلب (شانتی) حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ خدمت خلق ہی اُس کی عبادت ہوتی ہے اُسے نہ نتائج کی فکر ہوتی ہے اور نہ صلہ کی پروا اور نہ اس دُنیا اور نہ کسی اور جہاں میں کسی انعام کی تمنا۔ جس کو اپنی آتما کے شعور واحساس کی دولت مل گئی بھلا اُس کو یہ تمام کائنات اور دے بھی کیا سکتی ہے۔

گیانی نام روپ کے ہر بندھن سے آزاد ہے۔ وہ نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان نہ بودھی نہ عیسائی۔ انسان کسی ایک دینی یا سماجی ضابطے میں بندھ کر گیانی نہیں ہوسکتا۔ سچا گیانی دراصل ہندو بھی ہے مسلمان بھی بودھی بھی اور عیسائی۔ اُس کی وحدت میں یہ سب صورتیں شامل

ہیں۔اُس کے سب کام خدا کے نام پر ہوتے ہیں اور جب انسان اپنے تمام عمل (کرم) بھگوان کے سپرد (ارپن) کردیتا ہے وہ کرموں کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے۔وہ نہ عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے اور نہ ردعمل کا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیانی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے بلکہ اس کے کام بھگوان کی مرضی سے ہوتے ہیں۔

گیانی حیرت انگیز حد تک عقل پسند ہوتا ہے۔وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر رکھتا ہے اُس کی عقل سلیم جس بات کو پسند نہیں کرتی وہ اُس سے انکار کرنے میں رتی بھر بھی ہچکچاتا نہیں خواہ وہ اعتقاد ہو یا مقدس دینی کتابوں کا حکم۔ یہاں تک کہ اُس کو لازوال اور لافانی چیز کا شعور حاصل ہو جاتا ہے جسے رد نہیں کیا جاسکتا اور وہ اسطرح اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔جسے ''نروان'' کہتے ہیں۔



نروان کیا ہے

احساس اور شعور خودی جسے ایک دفعہ لمحہ بھر کے لئے پا لینے کے بعد بھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے انفرادیت۔ علیحدگی اور کثرت کا پردہ ہمیشہ کے لئے ہٹ جاتا ہے۔ یہ آنکھیں ظاہری مناظر کو دیکھتی ضرور ہیں لیکن ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اصلیت کیا ہے۔ اب ہم گھڑی بھر کے لئے بھی حقیقت سے غافل نہیں رہتے۔ ہر لمحہ اُس سے آگاہ رہتے ہیں۔ جب کم آگہی کا حجاب اُٹھ جاتا ہے تو ہماری خودی بصد شان و شوکت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اُسے نروان کہتے ہیں۔ یعنی ظاہر میں باطن کا جلوہ دیکھنا نروان ہے۔ دھیان اور گیان سے دِل و دماغ پاکیزہ ہو جاتا ہے اور یہی گیان اور دھیان معرفت نور کی کرن بن کر نروان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ گویا ست چت اور آنند نروان ہے۔

روحانیت کا کمال تو یہی ہے کہ انسان اپنے کمال کو پوری شدت سے محسوس کرے۔ جب انسان واقعی اس ایک آتما سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اُس کے لئے ہر بات ممکن ہو جاتی ہے۔ اور مایا (مادّی دُنیا) اُس کی غلام ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ دودھ میں پانی مل کر علیحدہ نہیں ہو سکتا لیکن جب مکھن نکال لیا جائے تو اُسے پانی یا دُودھ جس میں چاہے رکھ سکتے ہیں۔ وہ کبھی ان میں مل نہیں سکتا۔ اس طرح انسان جب اپنی حقیقی خودی کو پالیتا ہے تو دُنیا اُسے آلودہ نہیں کر سکتی۔ جب مٹی کے برتن کو ایک بار آنچ دیدی جائے تو اُن کی ساخت بدلی نہیں جا سکتی لیکن کچی مٹی اور گیلی مٹی کو جیسے چاہے توڑا موڑا جا سکتا ہے۔ ہمارا من جب ایک بار رُوحانیت کی آگ سے تپ جاتا ہے تو ایک مستقل شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس کو ایک بار بارگاہِ الٰہی میں رسائی ہو گئی وہ دُنیا میں رہ کر بھی خدا کا ہو جاتا ہے۔ مردِ کامل کا من (دِل) پوری طرح اُس کے بس میں ہو جاتا ہے اور بس کئے ہوئے من کو تیز شعائیں جہاں کہیں بھی پڑتی ہیں جہالت اور ظلمت مٹ جاتی ہے اور آگہی فوراً دسترس میں آجاتی ہے۔ پاک دِل و دِماغ جس چیز کو خواہش کرتا ہے وہ اُسے جھٹ مل جاتی ہے۔ اِس دُنیا میں بھی ہماری سچی ملکیت فقط اُس چیز پر

ہوتی ہے جو خود ہماری پیدا کردہ ہوتی ہے۔ روحانیت کے میدان میں بھی ہمیں وہیں ملتا ہے جس کے لئے ہم دِل لگا کر کوشش کرتے ہیں اور رُوحانیت کی بلندیاں بس متواتر جدوجہد سے حاصل ہوتی ہیں۔

مردِ کامل کے کمال میں اضافی علم کی کمی سے فرق نہیں آتا۔ اُس کا گیانی (علم) ہماری اضافی واقفیت سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ منطق اور دلائل سے کام نہیں لیتا اُس کا وجدان شدت احساس وشعور کا مخزن ہوتا ہے۔

زندگی کا ظہور تین مدارج میں ہوتا ہے اور یہ تین مدارج ہر جاندار میں نظر آتے ہیں۔

پہلا درجہ ہے تحت الشور کا: اس کے تحت جاندار میکانکی انداز سے جیتا ہے دوسرا درجہ ہے شعور: اور یہاں جاندار کو احساسِ خودی ہوجاتا ہے۔ وہ وقوف حاصل کرتا ہے اور سوچ وِچار سے کام لینے لگتا ہے اور اُسے ہر کام کی ذمہ داری قبول کرنا پڑتی ہے۔

تیسرا درجہ ہے فوق الشعور کا یعنی وجدان کا، یہاں احساس خودی اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور علم معرفت کی منزل تک پہنچ کر مکمل ہوجاتا ہے۔

مدارج تین ہیں لیکن زندگی ایک

انسان جب زندگی کے تیسرے درجے یعنی فوق الشعور تک پہنچ جاتا ہے جب وہ خدا سے واصل ہو جاتا ہے اور اُسے زندگی سے اپنے لئے کچھ حاصل کرنا باقی نہیں رہ جاتا، وہ زندہ رہتا ہے تو دوسروں کے لئے دُنیا کی بھلائی کے لئے اپنے علم کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے۔ اُس کی ہستی کی وسعتوں میں تمام کائنات بس جاتی ہے۔ زندگی اُس کے لئے ایک ہو جاتی ہے۔

تمام تفرقات مِٹ جاتے ہیں۔ آخر یہ تفرقات پیدا ہی ہوتے ہیں کسی چیز کی کمی سے جہاں زندگی بھرپور ہے وہاں فرق اور تمیز کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

گیان کی راہ عمل کا پہلا قدم ہے سب کو برابر ماننا۔ کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھنا، گناہ ہے تو وہ ہے بس نابرابری کا احساس۔ پاپی ہی کی نظر پاپ پر پڑتی ہے۔ جو واقعی پاک ہے اُسے ناپاکی نظر ہی کہاں آئے گی۔ پاک نگاہیں پیدا کرنا اور انسان کو محض انسان نہ سمجھنا بلکہ اُس کی یزدانیت پر نظر ڈالنا ہی سچا گیان ہے۔ جہنم اُسی جگہ کا نام ہے جہاں گناہگار رہتے ہیں۔ جب ہمیں اپنے اردگرد پاپ اور پاپی ہی نظر آئیں

گے تو ہم جہنم مین ہیں لیکن جب ہماری نظر پاک ہوجاتی ہے اور ہمیں کوئی گناہگار نظر نہیں آتا تو ہماری دُنیا جنت بن جاتی ہے۔

ہمارا مقصد کمال خودی حاصل کرنے کے لئے جسمانی انفرادیت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنی جسمانی شخصیت سے جلد سے جلد اُوپر اُٹھ جانا چاہئے۔ گیان کا آدرش اور منزل مقصود اُس کی معراج اپنی خودی سے آگاہی حاصل کرنا ہے جس کے لئے اُسے ہر وقت کوشاں رہنا ہے۔ ہماری روحانی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے خیالات ہمارے لئے نہایت ہی اہم درجہ رکھتے ہیں۔

انسان کا دِل پاک ہونا چاہئے اور پاک دِل وہ ہے جسے صرف اچھائی نظر آتی ہے برائی نہیں دکھائی دیتی۔ جب ہم عملی طور پر سب کو برابر سمجھنے لگیں گے جب ہمارے قول و فعل میں پوری مطابقت پیدا ہوجائے گی تو ہم سے سوائے بھلائی کے کاموں کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ جب ہم قولاً اخوت اور فعلاً خدمت کا ثبوت بہم پہنچائیں گے تو ہماری ساری دنیا ہماری زندگی معنیً سے بھرپور اور مسرت و نشاط سے لبریز ہوجائے گی۔

انسان ہی میں درحقیقت کائنات کا راز مضمر ہے۔ اب تک ہمارا علم خود انسان کے بارے میں نہایت محدود رہا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ کائنات کے بارے میں بھی ہمارا علم بہت کم ہے۔ جب ہمیں انسان کے متعلق زیادہ واقفیت ہو جائے گی تو ہم یقیناً کائنات سے بھی زیادہ واقف ہو جائیں گے۔ انسان حواس کی سرحدوں کو پار کر کے منجمد کائنات کو خودی کی گرمی سے پگھلا سکتا ہے۔ محدودیت سے نکل جانے کا نام ہی حصول خودی وصل الٰہی یا معرفت آگہی ہے۔ کثرت دید سے نجات اُسی وقت ملتی ہے جب ہماری رسائی مرکز حیات تک پہنچ جاتی ہے۔ بھگوان سے واصل ہو کر ہی ہم حواس کے دھوکوں سے بچ سکتے ہیں۔

انسانی زندگی کے دو مقصد ہیں۔ ایک گیان یعنی حقیقی آگہی اور دوسرا آنند یعنی سکون کامل یا نشاط رُوح۔ احساس خودی یعنی یقین آزاری اور اختیار کُل کے بغیر اِن دونوں کا حاصل ہونا ناممکن ہے۔

انسان قدرت کا سب سے اچھا آئینہ ہے۔ انسان جتنا زیادہ پاک وصاف ہوگا اُتنا ہی پاک وصاف خدا کا جلوہ اپنے اندر دیکھ پائے گا۔ ہماری پاکیزگی بے غرضی اور خود سپردگی میں چھپی ہوئی ہے۔ جب

ہمارا طریقہ کار خدمت خلق ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی زندگی سیوا کے لئے وقف کر دیتے ہیں ہم تفریق۔ نفرت اور خوف سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ حق ہے تو خدمت خلق کا حق۔ یہی سچی پوجا ہے کیونکہ اس کے پیچھے پریم چھپا ہے۔ اس کا محرک پریم ہے اور پریم ہی بنیادی حقیقت ہے۔ پریم ہی سب کچھ ہے پریم ہی بھگوان اور پریم ہی پجاری۔

جہاں ہم نے تفریق کو مٹایا نفرت کا ناش کیا محبت اور بے خوفی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ وحدت اور یکسانیت ہمارے سب قوانین کی حد بندیوں کو مٹا کر اُنہیں اس قدر وسعت بخش دیتی ہے کہ زندگی کا بس ایک ہی ہمہ گیر قانون رہ جاتا ہے اور وہ ہے وحدت حیات۔ انفرادیت کی موت وحدت حیات کی زندگی ہے۔ محدود زندگی کو خیر آباد کر کے کائناتی اور لامحدود زندگی کا آغاز کرنا ہی رُوحانیت ہے۔

خارجی رسوم یا طرز عمل نہ پوجا ہے نہ عبادت، عبادت ہے تو اس جذبۂ ایثار اور خلوص کا نام جو مندر میں مورتی کے آگے سر جھکاتے، مسجد میں نماز پڑھنے یا گرجا میں دُعا کرتے وقت دِل میں پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے بندوں کی خدمت ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ درخت کی جڑ میں

پانی دینے سے سارا درخت ہرا بھرا ہو جاتا ہے۔ پتّے پتّے کو پانی دینے کی کوشش بے سود ہے۔

پربھو ملن کی لگن، وصل الٰہی کی آرزو ایک نہایت ہی نرم و نازک پودا ہے۔ مقدس مذہبی کتابیں، وید پران، انجیل، قرآن، بائبل، گرنتھ وہ چھوٹے چھوٹے گملے ہیں جن میں یہ پودا اُگایا جاتا ہے۔ لیکن اِن گملوں میں یہ پودا پروان نہیں چڑھتا۔ اِن سے نکال کر اِسکی جڑیں کائنات کی حقیقتوں کی زمین میں پھیلانا نتیجہ خیز بنتی ہیں۔

تین گُن

دُکھ اور سُکھ دونوں زنجیریں ہیں۔ ایک زنجیر سونے کی ہے اور دوسری لوہے کی۔ لیکن دونوں زنجیریں ہمیں جکڑنے کے کام آتی ہیں اور دونوں یکساں طور مضبوط ہیں۔ دونوں ہی ہمیں اپنی اصلی فطرت اپنے مرکز کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ آتما دُکھ اور سُکھ دونوں سے بالا ہے۔ آیئے ہم اپنی آنکھوں سے کثافت کے پردے ہٹا کر دیکھیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے۔ آیئے ہم اپنی خودی کی چٹان پر کھڑے ہو کر پورے سکون

اور اطمینان کے ساتھ اس دُنیا کے تماشے پر نظر ڈالیں۔ ہم اس سنسار میں سکھ حاصل نہیں کر سکتے۔ سکھ اور چین ہمارے اندر موجود ہے۔ ہمارے باطن میں جتنا زیادہ آنند ہے اُتنے ہی ہم رُوحانیت کے نزدیک ہیں۔ ہماری خودی جس قدر بلند ہے اُتنا ہی ہم خدا کے نزدیک ہیں۔

ہر جاندار میں تین گن یا خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے ادنیٰ ہے ''تامس'' کا گن۔ اس گن والے لوگ بس کھانے پینے اور آرام کرنے میں لگے رہتے ہیں، اُنہیں کبھی جسمانی یا دماغی ترقی کا خیال نہیں آتا۔ اور وہ ساری زندگی جانوروں کی طرح گذارتے ہیں۔ اس سے اُوپر ہے ''راجس'' کا گن یہ خاصیت ہے اُن لوگوں کی جن کی طبیعت کا رجحان عمل کی طرف ہوتا ہے۔ اُن لوگوں میں خود پسندی کا مادّہ بھرا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بڑائی کرتے ہیں اور ''میں'' ''میں'' لفظ ہر وقت اُن کی زبان پر رہتا ہے۔ لیکن اِسی جذبے کے تحت اُن سے دُنیا کے سب کام ہوتے ہیں۔ جب اِن لوگوں کے عمل کا رُخ اچھے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے تو اِن میں رُوحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سب سے اعلیٰ گن ہے ستوگن کا یعنی داخلی معرفت کا گن۔ ستوگن والے لوگ وحدت خودی کے احساس کو کبھی نہیں بھولتے۔ ایسا

نہیں ہے کہ تمام نسل انسانی تین حصوں میں تقسیم ہے بلکہ یہ تین گن کم و بیش ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی آدمی میں مختلف اوقات پر مختلف گن غالب آتے ہیں۔ کسی وقت ستو کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی راجس عمل میں آتا ہے اور کبھی تامس نمودار ہوجاتا ہے۔ اِرتقا کا تقاضا ہے کہ ہم تامس کو راجس سے مغلوب کریں اور پھر دونوں کو ستو میں جذب کریں۔

کائنات اور مالک کائنات الگ الگ نہیں جس طرح خدا کی تخلیق کائنات کے وجود سے ہوئی ہے اُسی طرح کائنات کسی عمل یا تخلیق کا نام نہیں۔ کوئی چیز کسی سے بنائی نہیں گئی۔ کائنات کی ہستی بالذات ہے۔ وہ ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ زندگی ایک قسم کا توازن حاصل کرنے کی کشمکش کا نام ہے۔

دُنیا ایک آئینہ خانہ ہے۔ اس میں لُطف اُٹھایئے۔ دیکھتے جایئے، لیکن یہاں اپنے آپ کو قید مت کریئے۔ اس سے لگاؤ پیدا کر کے آخر ہمیں دستیاب کیا ہوسکتا ہے۔ اس دلدل سے نکل کر صاف اور پاک ہو کر اپنی خودی کی دولت حاصل کرنا ہی دھرم اور ایمان ہے۔ سچا مذہب لامحدود ہی کی طاقت کا دوسرا نام ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس

خدائی قدرت اس لاانتہا طاقت کو خود اپنے اندر محسوس کرنا مکمل آزادی کا شعور واحساس ہے۔ یہی رُوحانیت ہے۔ خودی اور خدا دو مختلف چیزیں نہیں دراصل ایک ہی چیز کے دو مختلف رُخ ہیں۔

ہم اپنی خودی کو تب ہی بیدار کر سکتے ہیں جب ہم یہ سمجھیں کہ ہم محض جسم نہیں جو فانی ہے بلکہ ہم یہ سمجھیں کہ ہم رُوح ہیں جو لافانی ہے۔ رُوح جب جسم میں رہے تو اُس کا غلام ہو کر نہ رہے۔ یہ جسم ہمارا ہے ہم اس کے نہیں۔ جب تک انانیت نابود نہیں ہو جاتی نوع انسانی کی خدمت مدد اور یکسانیت کی طاقت پیدا ہونا ناممکن ہے اور جب انانیت نابود ہو جاتی ہے اخلاص اور سکون پیدا ہو جاتا ہے اور یہی اخلاص اور سکون طاقت اور شکتی کا سرچشمہ ہے۔

وحدت کل کے احساس میں ڈوب جانیکو ہی مکتی کہتے ہیں۔ بنی نوع انسان عموماً غیب کے بجائے شہود کی پرستش کو ترجیح دیتے ہیں، جس چیز کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں وہ اُسی کے آگے سر جھکانے کو تیار رہتے ہیں اور اُس حقیقت سے گریزاں رہتے ہیں جو ہر شئے میں موجود ہے۔ اور جس کی بدولت ہر چیز کی ہستی ہے۔ دُنیا میں بار بار پیغمبر آئے اُنہوں نے اِسی حقیقت کو طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور

اعلان کیا کہ ہماری محدود شخصیت کے پس پردہ وہی ذات کارفرما ہے۔ کسی اَوتار یا پیغمبر کا جیسا زمانہ اور ماحول تھا اُس کے مطابق ہی اُس نے اس حقیقت کو بیان کیا۔ انسانی اِرتقا کے جس مقام پر لوگ اُس وقت پہنچ چکے تھے اُس کے لحاظ سے اس غیر تغیر پذیر صداقت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال کر مستشقل کیا اور اس طرح صداقت مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہوئی۔

ہمیں اِن تمام صورتوں سے گذر کر حقیقت کو پانا ہے۔ ہمیں اس واحد حقیقت کو ہر جگہ اور ہر حال میں جلوہ گر کرنا ہوگا۔ ہمیں آرام کی زندگی میں بھی اور مصیبت کی زندگی میں بھی مسکرانا ہوگا۔ اور ہر رنگ میں بس ایک ہی جلوہ دیکھنا ہوگا۔ گیان یا آگہی کا سرچشمہ تو ہر وقت اور ہر حال میں ہمارے اندر موجود ہے۔

کائنات کے ہر ذرّے میں معرفت کا خورشید درخشان ہے۔ ادنیٰ چیونٹی سے لیکر فرشتوں کے بلند مقام تک ایک ہی نور جلوہ پاش ہیں۔ سچا مذہب ایک ہے اور وہ ہے اس وحدت کُل کا شعور و احساس، پرستش کا جذبہ تو انسان کی فطرت میں رچا ہوا ہے۔ ہر جبیں سجدوں کے لئے بے تاب ہے اور اُس حقیقت کے متلاشی کو اس جبیں سے ہر شئے کو

سجدہ کرنا ہوگا۔ یہی سب سے بلند اور اعلیٰ مقام ہے۔ اس سے کم بلند مقام پر انسان ہمیشہ خدا کو ایک شخصیت قرار دے کر اُس کی پرستش کرتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں اگر نشان کو نشان سمجھا جائے لیکن اس کو اصل کبھی نہ سمجھا جائے۔ نشان کوئی بھی ہو مورتی یا مذہبی یا دینی کتاب اور جب تک اُسے الواہیت کی علامت سمجھ کر پوجا جاتا ہے ہمیں حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مورتی بھگوان نہیں بن سکتی۔ دینی کتاب خدا نہیں بن سکتی۔ یاد رکھئے مورتی کی مدد سے ہمیں بھگوان کو پانا ہے۔ دینی کتاب کے سہارے ہمیں خدا تک پہنچنا ہے۔ دینی کتابیں نشان راہ ہیں۔ ہماری منزل نہیں۔ منزل اس سے کہیں آگے ہے۔ ہماری منزل ہے "ست چت آنند"۔

سکون مطلق نشاط کامل، حواس سے پرغیر فانی آگہی۔



مذہب اور عملی زندگی

کام کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جس میں ہمارا دِماغی توازن قائم رہ سکے، اوراس میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آنے پائے۔ اس کے لئے دِل میں جتنا جذبہ، جتنا ہیجان کم ہوگا اُتنا ہی زیادہ اچھا ہوگا۔ ہماری طبیعت میں جسقدر سکون ہوگا، ہم جس قدر زیادہ شانتی سے کام لیں گے اتنا ہی ہمارے حق میں بہتری ہوگی، مقدار میں اُتنا ہی زیادہ کام ہماری ذات سے سرانجام ہو پائیگا۔ ہمارے جذبات واحساسات میں جہاں ذرّہ بھی انتشار پیدا ہوجاتا ہے اُن میں ڈھیل واقع ہوجاتی ہے نہ جانے ہماری کتنی قوت اور طاقت رائیگاں چلی جاتی ہے۔ سارا نظام اعصابی درہم برہم ہوجاتا ہے، دماغی سکون میں فرق آجاتا ہے۔ جن لوگوں کو بات بات پر غصہ آجاتا ہے وہ مقدار میں کبھی زیادہ کام سرانجام نہیں دے پاتے۔ لیکن جو شخص صبر وسکون سے کام لیتا ہے، جس میں خطا پوشی کا مادّہ ہے اور جس کے مزاج میں توازن ہے، جس کی طبیعت

ہموار ہوتی ہے، ڈاما ڈول نہیں ہوتی۔ صرف ایسا ہی انسان زیادہ سے زیادہ مقدار میں کام کر سکتا ہے۔

انسانی فطرت میں دو قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں جن کے تحت انسان کوئی کام کرتا ہے اور ہر کام کے پیچھے کوئی مقصد یا کوئی آدرش کارفرما ہوتا ہے۔ ایک رجحان کے زیر اثر انسان آدرش کو عام زندگی کی پستی تک کھینچ لاتا ہے اور دوسرے رجحان کے تحت وہ اپنی زندگی کو بلند کر کے آدرش کی سطح پر چلا جاتا ہے۔ مذہب کے اصلی آدرش کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں خود کو اخلاقی اور رُوحانی بلندیوں تک جانا ہوگا۔ یہ آدرش جھک کر ہماری سطح تک آنے والا آدرش نہیں۔ آدرش بلند رہیگا تو ہم کبھی نہ کبھی اس بلندی تک پہنچ ہی جائیں گے۔ لیکن اگر ہم اپنے آپ کو دھوکا دے کر ایک سطحی آدرش قائم کر لیتے ہیں تو ترقی اور رفتار کی عام رائیں بند ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ہم پستی کی طرف گرنے لگتے ہیں۔

ویدانت کہتا ہے کہ خودی کے اس اظہار کے لئے اور اصلی آدرش کے حصول کے لئے جنگلوں اور گہری گپھاؤں میں بیٹھنا کچھ ضروری نہیں۔ ہر شعبہ زندگی سے متعلق انسان اِس آدرش کی تکمیل کر سکتا

ہے اور اس طرح اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے اس حقیقت اور مرکزی خیال کو ویدانت نے ''توحید'' کا نام دیا ہے۔ یعنی ویدانت کو رُو سے زندگی کی دو صورتیں نہیں۔ حیات ابدی اور لافانی ہے۔ اس کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ دُنیا صرف ایک، اور ہستی یا وجود صرف ایک، دُنیا میں جتنی سبھی چیزیں ہیں وہ سب کی سب اِسی وحدت میں جذب ہیں۔ اگر ہمیں بظاہر کوئی فرق نظر آتا ہے تو وہ مدارج میں ہوتا ہے۔ نوعیت میں نہیں۔ ویدانت کی رُو سے جانوروں اور انسانوں کے وجود میں کوئی فرق نہیں۔ ظاہراً اگر فرق ہے تو وہ ہے مرتبہ کا لیکن نوعیت کا نہیں۔ اگر انسان کی زندگی لافانی ہے تو جانوروں کی زندگی بھی لافانی ہے۔ وہ بھی وحدت حیات کے حصہ دار ہیں۔ آدمی ہو یا جانور زندگی دونوں کی ایک ہی ہے۔ جان سب کی برابر ہے اور جو لوگ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا فرق سمجھتے ہیں وہ اصلیت سے بے خبر ہیں اور اپنی کم نظری اور کم آگہی سے اپنی خود غرضی کو ایک سستے قسم کے فلسفہ حیات کا رنگ دے کر اپنے آپ کو بلکہ دوسروں کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔

فطرت انسانی میں قدامت پسندی کا رجحان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ہم ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ ہم پر آرام طلبی کی

نمودگی کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ ہمیں اپنی انسانیت کی موت تک بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ آج انسان خواہشات کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر خود اپنی تحقیر کا موجب بنا ہوا ہے۔ ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا وجود ایک عظیم اور پاک طاقت سے بھرپور ہے۔ ہمارے اندر طاقت کا ایک سمندر چھپا ہوا ہے اور اس طاقت کو انسانیت کے لئے بیدار کرنا ہی معراج اور خود آگہی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی رُوحانی آزادی کا احساس رکھتے ہوئے یزدانی مراتب کی طرف اُٹھ کھڑے ہو جائیں۔ ہمیں دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم سب کی منزل ایک ہے۔ ہم ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ کمزوری اور طاقت، نیکی اور بدی، امیر اور غریبی، علم اور جہالت، زندگی اور موت، دوزخ اور بہشت کے درمیان جو بھی فرق ہے وہ صرف درجے کا ہے۔ لیکن ہر چیز کی اصل وحدت میں مخفی ہے۔ اگر ہمیں حقیقی معنوں میں روحانی معراج کی خواہش ہے تو ہمیں بے لوث کام کرتے ہوئے، رنج الم میں ڈوب کر بھی نشاطِ کا تقاضا کرنا ہوگا۔ ظلمات میں گھِر کر بھی نور کی تلاش کرنا ہوگی۔ گندگی اور سٹرائنڈ کے ماحول میں بھی رنگ و بو کے خیال سے وابستہ رہنا ہوگا۔ شیطانیت کے طوفان

میں بھی یزدانیت کو محفوظ رکھنا ہوگا۔ حیوانیت کے دور میں بھی انسانیت کا علمبردار ہونا ہوگا۔ جھوٹ کے جابرانہ عہد میں سچائی پر جان دینا ہوگی اور شوروغل میں بھی نغمہ ازلی کی سماعت کرنا ہوگی۔ جب جاکر ہم موت کو شکست دے سکیں گے اور اپنی زندگی کو جاوید بنا سکیں گے۔ یہی کام کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ اسی طریقے کو ہم نے اپنی روزہ مرہ زندگی میں اُتارنا ہوگا۔ ہماری زندگی چاہے شہری ہو یا دیہاتی۔ انفرادی ہو یا قومی اگر ہم مذہب کے اس عملی پہلو کو اس میں نہیں اُتار سکتے تو بے کار ہے۔ سچا مذہب ہر حالت میں اور ہر وقت بنی نوع انسان کی مدد کرنے کے قابل ہوا ہے اور فی الواقع مدد کرے۔

ہمارے پس پشت جو لاانتہا طاقت اور فضل برکت کا بے پایاں سمندر تلاطم خیز ہے ہم نے اُس کو ساری انسانیت کے لئے اُجاگر کرنا ہوگا اور ہم طاقت کے اس ممبع تک پہنچ سکتے ہیں ہم نے اس جسم کو زندہ رکھنے کے لئے زندہ نہیں رہنا ہے بلکہ زندگی کے معراج کو پانے کے لئے موت کے خیال کو نیست نابود کرنا ہوگا۔ ہم صرف ہڈی مانس کے پتلے نہیں بلکہ ہم آتما ہیں۔ ویدانت کہتا ہے کہ رُوحانی جستجو کا پہلا قدم یہ ہے کہ آتما کا ذکر سنا جائے اور اُس پر غور کیا جائے۔ دِن رات ہمارے

کانوں میں یہی آواز گونجنی چاہئے کہ ''میں آتما ہوں'' میں رُوح ہوں ہمارے رگ رگ میں ریشے ریشے میں یہی آتما کی گونج پیوست ہو جانی چاہئے۔ ہمارے خون کے ہر قطرے میں یہی جھنکار۔ ہڈی ہڈی میں یہی کلمہ سرایت کر جانا چاہئے کہ میں آتما ہوں۔ جو امر ہے جو جینے اور مرنے کی قید سے آزاد ہے۔ جو آنند ہے۔ سراپا سرور ہے۔ عالم کُل ہے، قادرِ مطلق ہے، ہم نے اسی خیال کو اور اسی تصور کو اور اسی آدرش کو اپنی عملی زندگی میں اُتارنا ہوگا اور ہم دیکھیں گے کہ ہمارا ہر قدم صحیح ہوگا۔ ہر کام آسان ہوگا مکمل ہوگا۔ لازوال ہوگا اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ انسان کے منہ سے سچی بات اُسی وقت نکلتی ہے، جب اُس کا دِل خدا کے خیال سے بھرپور ہوتا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے اُسی حالت میں نیک کام ہو جاتا ہے۔ جب اُس کے دِل میں یزدانی صداقت پوری طرح کارفرما ہوتی ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنی ذات کی عظمت کے خیال سے بھر لیں۔ ہمارے خیالوں کو ہمارا غلام ہونا چاہئے۔

پچھلے ہزاروں سال سے انکشاف ذات ہی بنی نوع انسان کی تمام سرگرمیوں کا واحد مقصد رہا ہے۔ جو لوگ پاک دِل اور روشن ضمیر

ہیں اُن کے لئے ایسا وقت آتا ہے جب یہ سارا کھیل آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور دُنیا مجسم ''برم'' بن جاتی ہے اور اُس میں ہر طرف اور ہر شکل میں خدا ہی خدا نظر آنے لگتا ہے۔



مذہب دِل اور دِماغ

مذہب کے معاملے میں دِماغ (عقل وخرد) کا کچھ زیادہ کام نہیں۔سب سے اہم چیز ہے دِل، خدا کا تصور دِماغ میں تو آ نہیں سکتا۔ اُس کا جلوہ دِل سے پایا جا سکتا ہے۔ عقل و دِماغ کی اتنی اہمیت ضرور ہے کہ یہ رُوحانی راہ کو آسان بنانے میں مدد کرتے ہیں۔لیکن ہمارا کام اس وقت ہو جاتا ہے جب ہم اُسے کرنے کی دِل سے ٹھان لیتے ہیں۔ ارادہ مصمم ہو تو کام بجلی کی تیزی سے ہو جاتا ہے۔اگر ہم دِل سے رُوحانی ترقی کی آرزو رکھتے ہیں تو یقیناً خدا کا دیدار حاصل ہوگا آپ کے دِل میں جو یہ احساس ہے اُس میں زور پیدا ہوگا اور وہ قوی سے قوی تر ہوتا ہوا آخر خودی کے اُس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں خودی اور خدا میں کسی قسم کا امتیاز نہیں رہتا۔ جہاں خالق اور تخلیق میں فرق مِٹ جاتا ہے۔ آپ کو ہر چیز کا وجود محسوس ہونے لگے گا۔ ہر چیز میں وحدت نظر آنے لگے گی اور خود اپنے اندر اور دوسروں کی ہستی میں خدا کی ہستی کا اشراف

ہونے لگے گا۔ اس طرح خدا تک رسائی دِل کی ہوتی ہے۔ عقل کی نہیں۔ عقل ضروری چیز ہے کیونکہ عقل کے بغیر ہم سے بڑی بڑی کوتائیاں سرزد ہوجاتی ہے۔ ہم نہ جانے کیسی کیسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ عقل سے اِن غلطیوں اور کوتاہیوں کی روک تھام ہوتی ہے لیکن عقل کا دائرہ صرف یہیں تک ہے۔ عقل آپ کو گرنے سے بچا سکتی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے کے لئے محرک نہیں کرسکتی۔ آگے بڑھنے کے لئے تو فولادی دِل چاہئے۔ آپ کا اصلی مددگار تو دِل ہے۔ اگر آپ کے احساس میں شدت ہے۔ آپ کے جذبہ محبت میں گرمی ہے، آپ دوسروں کے دُکھ سکھ کو اپنا دُکھ سُکھ سمجھتے ہیں تو آپ زندہ دِل ہیں۔ لیکن اگر آپ ہمدردی کے جوہر سے محروم ہیں تو آپ دُنیا کے سب سے بڑے عاقل اور دانا انسان ہوکر بھی مُردہ دِل ہیں۔ آپ کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ اگر آپ کے دِل میں تڑپ ہے آپ حساس ہیں تو آپ عالم ہو خواہ ان پڑھ، زبان دان ہو یا کوئی بھی زبان نہ جاننے والے آپ صحیح راستے پر گامزن ہیں یقیناً آپ کو خدا تک رسائی ہوگی۔

دُنیا کی تواریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی آپ نے سوچا ہے کہ پیغمبروں کی طاقت کا منبع کہاں تھا؟ آخر اُنہیں یہ طاقت کس سرچشمے

سے حاصل ہوئی تھی؟

کیا یہ طاقت اُنہیں عقل سے ملی تھی؟ کیا اُن میں سے کسی نے بھی فلسفہ پر کوئی اعلیٰ کتاب لکھی تھی؟ منطق کے پیچیدہ بحث ومباحثہ پر قلم اُٹھایا تھا؟ نہیں ان میں سے کسی نے بھی کوئی کتاب قلم بند نہیں کی۔ اُن کی زبان سے تو چند الفاظ نکلے تھے لیکن وہ لاکھوں انسانوں کو اپنی تیز وتند لہروں میں بہا کر دُنیا میں انقلاب پیدا کر گئے۔ کیا آپ میں بھی اِس شدت احساس کی اہلیت ہے؟

احساس ہی تو زندگی ہے۔ طاقت ہی قوت حیات ہے۔ دُنیا میں جو برگزیدہ شخصیتیں گذری ہیں اُن کے پیغام کا ثبوت یہی ہے کہ ہم اور آپ سب یکساں طور پر اُن کے احساسات کو اپنے دِل میں مؤجزن پاتے ہیں۔ اُن کی ہر بات پر کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ تو ہمارے دِل کی آواز ہے۔ اس لئے ہمارا پہلا قدم اپنے دِل کو مضبوط کرنا ہونا چاہیئے کیونکہ کام تو سب دِل کا ہے اور دِل نے کرنا ہے۔



ویدانت کا مدعا

ویدانت کا مدعا ہے خدا کو ہر چیز کے اندر دیکھنا۔ اشیائے گوناگوں کا مشاہدہ اُن کے اصلی رُوپ میں کرنا۔ اُن کو اُن کی ظاہری شکل میں نہ دیکھنا۔ وید اعلان کرتے ہیں کہ انسان کو خود اپنی ذات میں عالم حقیقت کی تلاش کرنی چاہیئے۔ انسان کو خود اپنی تلاش کا مرکز ہونا چاہیئے۔ خدا کی پرستش کے لئے ایجاد کردہ نشانات ممکن ہے اچھے ہوں اور کار آمد بھی لیکن جتنے نشانات ہم ایجاد کر سکتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ نشانات پہلے سے موجود ہیں۔ آپ بھگوان کی پوجا کے لئے مورتی بنا سکتے ہیں لیکن اُس مورتی سے کہیں زیادہ اچھی مورتی یعنی انسان بقید حیات پہلے ہی سے موجود ہے۔ آپ بھگوان کی پوجا کے لئے عالیشان مندر تعمیر کر سکتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ بلند مندر یعنی یہ انسانی قالب ہمارے سامنے پہلے سے موجود ہیں۔ زندگی ایک مسلسل پرستش ہے۔

ویدوں کے دو حصے ہیں۔

۱۔ کرم کانڈ (بابِ عمل)

۲۔ گیان کا کانڈ (بابِ علم)

ایک کا تعلق شریعت یعنی پوجا کے مختلف رسم و رواج سے ہے اور دوسرے کا معرفت سے۔ ابتداء وقت سے شرعی رسوم کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے اور اِن میں اتنی پیچیدگی ہوگئی ہے کہ ان کا حل کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن باب علم یعنی گیان کانڈ کے ذریعہ انسان ہر جگہ اور ہر حال میں پرستش کرسکتا ہے۔ گیان کے ذریعہ ہمیں علم ہوجاتا ہے کہ یہ تمام کائنات بھی ایک عالی شان مندر ہے اور یہ زندہ باشعور انسانی اس متبرک اور غیبی طاقت کا سب سے بڑا اور عالیشان نشان ہے۔ مذہب چونکہ ایک عملی سائنس ہے اس لئے اِسی علم کو ہم نے اپنے عمل میں اُتارنا ہوگا اور تب ہی ہم مکمل آزاد ہوسکتے ہیں۔

پُنر جنم

علت و معمول کا اُصول ہے کہ نتیجہ ہمیشہ سبب کے مطابق ہوتا ہے۔ (Input=Output) یعنی جیسا سبب ہوگا ویسا ہی نتیجہ بھی ہوگا۔ اگر سبب دوامی ہوگا نتیجہ بھی دوامی ہوگا۔ اس طرح یہ تمام اسباب

یعنی نیک کام کرنا یا اسی قسم کی دوسری باتیں عمل میں لانا محدود اسباب ہیں اور اسی لئے اِن کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بھی لامحدود نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی رُوح بار بار جنم لیتی ہے۔ یہاں سے جا کر کسی دوامی جنت میں قیام نہیں کرتی۔ اور نہ ہی کسی جہنم کی آگ میں ہمیشہ جلتی رہتی ہے۔ اگر اِس چندروزہ زندگی کے گناہوں کی سزا دوامی ہوگی تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ایک محدود سبب کا لامحدود نتیجہ برآمد ہوا۔ مگر ایسا ممکن نہیں۔ اگر میں تمام عمر نیک کام کرتا رہا ہوں تو مجھے اس کے اجر میں بہشت ملے گی وہ بھی دوامی نہیں ہوگی۔ ایسا خیال کرنا اتنا غلط ہوگا جتنا یہ کہنا کہ مجھے گناہوں کے پاداش میں ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ یہ تمام کائنات عمل اور ردعمل کا لاانتہا سلسلہ ہے۔ اپنشد بتاتے ہیں کہ ہر دائرہ عمل سے باہر بھی نکل سکتے ہیں نیک اور بد کے دوراہے سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ بھی ہے جو صرف اُن لوگوں پر کھلتا ہے جنہیں سچائی کا ذاتی علم ہو جاتا ہے۔ جنہیں عملی طور حقیقت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مایا کے اس پردے سے باہر نکلنے کا ایک یہی وسیلہ ہے کہ انسان سچائی کو عملی طور پر محسوس کرے۔ اپنے آپ کو پہچانئے اور اُس کو حاصل کرنے کا طریقہ ہے نیکی اور بدی کے تضاد کو

مٹا دینا۔ نیکی اور بدی کے دو ظاہری رنگ ہیں اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اُن کا اعتراف فسون نظری ہے۔ دراصل ہر شئے ہماری ذات یا آتما میں بسی ہوئی ہے۔ اُسی سے اِس کا انکشاف ہو رہا ہے۔ ہر عمل کی محرک خود آتما ہے۔ اُس کے علاوہ اور کسی شئے کی ہستی ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایک طرح سے سارے عالم کائنات کے وجود سے انکار کرنا ہوگا۔ اُس کی ظاہری صورت سے آنکھیں بند کر کے اُس کے اصلی رُوپ کو دیکھنا ہوگا۔ سورگ، نرک، بہشت اور دوزخ میں ایک ہی خدا کو دیکھنا ہوگا۔ زندگی میں بھی اُسی کا مشاہدہ کرنا ہوگا اور موت میں بھی۔ ایسا نہیں کہ نیکی خوشی اور زندگی تو بھگوان کا رُوپ ہیں اور برائی غمی اور موت کی کوئی اور ہستی ہے۔

ویدانت کے مطابق جب انسان کو وہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جب اُس کو ہر چیز میں اور ہر حال میں بھگوان کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے اُس وقت اُس کو مکتی یا نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

دُکھ سکھ کسی کے دینے سے نہیں ملتے یہ اپنی ہی دماغی اور روحانی حالتوں کے مختلف نام ہیں۔ سزا و جزا کے تصورات مادی ہوتے ہیں اور وہ ایک ایسے خدا کے تصور سے وابستہ ہوتے ہیں جس کو ہم نے اپنے

کردار کے مطابق ڈھالا ہے۔ جس کی خاصیت انسانی ہو اور جو بالکل ہماری طرح ایک شخص سے محبت کرتا ہے اور دوسرے سے نفرت۔ عام انسانوں کے لئے اس غیر شخصی تصور کا مفہوم سمجھنا نہایت مشکل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا دِماغ نظرتاً شخصی اور مجسم تصورات سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن ویدانت کے نظریہ کے مطابق ایک ایسے خدا کا تصور بے معنی معلوم ہوتا ہے جو بقید جسم ہو۔ جس کے کردار میں انسان کی سب خوبیاں اور خامیاں ایک بڑے پیانے پر موجود ہوں۔ جسے رحم بھی آتا ہو اور غصہ بھی۔ جس کے احکام میں ہمارے رسم ورواج کی جھلک ہو۔ جسے رحم بھی آتا ہو اور غصہ بھی۔ جس کے احکام میں ہمارے رسم و رواج کی جھلک ہو۔ ایسا خدا ایک بے جان تخیل ہے جسے ہم اپنے نقش پر تخلیق کرتے ہیں اور جس کے کارنامے ہم اور انسانی اعمال کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ زندہ خدا وہ ہے جس نے ہمیں خود اپنے نقش پر بنایا ہے۔ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے جسے ہم حواس خمسہ میں قید نہیں کر سکتے۔ زندہ خدا تو ایک غیر شخصی غیر مجسم مسلمہ حقیقت ہے جس میں فرشتے، انسان، حیوان بلکہ غیر ذی رُوح چیزیں بھی سمائی ہوئی ہیں۔ اور جو اِن سب میں موجود ہے۔ کائنات کا مظہر ہے لیکن کائنات

پر مشتمل نہیں بلکہ لامحدود ہے لازوال ہے اور لاثانی ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور ویدانت کہتا ہے کہ دُنیا میں خدا کے سوا کسی اور شئے کا وجود ہی نہیں۔ اور اس طرح ویدانت کا خدا ہر شئے میں موجود ہے اور سب سے نزدیکی چیز جس میں ہم اُس خدا کو دیکھ سکتے ہیں، پرستش کر سکتے ہیں، جلوہ گر پا سکتے ہیں وہ ہے ہماری رُوح جو ہمارے اس انسانی قالب میں نمودار ہو رہی ہے۔ اور جب ہمیں اس کا عملی طور پر احساس ہو جائے گا۔ جس وقت ہم ہر انسانی رُوح کے سامنے تقدس واحترام کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے، ہمیں اس کے اندر خدا کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔ اور اس طرح ہمارے تمام بندھن کٹ جائیں گے۔ ہم ہر قید سے آزاد ہو جائیں گے۔ ہمیں مکتی یا نجات حاصل ہو جائیگی۔ اس سے عملی پوجا اور کیا ہو سکتی ہے جسے ہم اس عالم کائنات میں ڈھونڈ رہے ہیں وہ تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارا وجود ہی اُس کا ثبوت ہے، اُس کی توسل سے ہے۔ اپنی ذات کو پانا ہی وصل الٰہی ہے، یہی ہماری سچی آزادی ہے اِسی میں ہماری عظمت ہے۔ جب تک ہم اپنے آپ سے غافل ہیں۔ اپنی شان شہنشاہی سے ناواقف ہیں ہم مجبور ہیں۔ مفلس و نادار ہیں۔ ہماری

زندگی کا مقصد اپنی حقیقت کو پانا ہے اس کی عملی صورت یہ نہیں کہ ہم دُنیا ترک کردیں۔ دُنیا سے آزاد ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ پاگلوں کی طرح سماج کو ٹھکرا دیں اور مکتی حاصل کرنے کے لئے جنگلوں یا ویرانوں میں چلے جائیں، ہمیں رہنا تو اِسی دُنیا میں ہے۔ مجبوری اور آزادی کی دُنیا میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم جہالت سے گذر کر آگہی کے مقام تک آجاتے ہیں۔ ہمارا ماحول نہیں بدلتا لیکن اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اس کا ایک نیا مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ہماری آنکھوں پر جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کے اُٹھ جانے سے ہمیں اس کائنات کا اصلی رُوپ نظر آتا ہے۔ ہمارے اندر ہر چیز کے لئے محبت کا ایک بے کراں سمندر اُبل پڑتا ہے۔ ہمارے لئے غیر اور اپنے میں فرق نہیں رہتا ہم اپنے آپ کو بھگوان کے سپرد کر دیتے ہیں اور ہر شئے میں اُسی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ لامحدودیت ہی ہماری حقیقی فطرت ہے۔

ہم نے اپنے کرموں کے ذریعہ خود کو محدود کر رکھا ہے، کرم ہماری گردن میں زنجیر کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں اس بندھن میں جکڑ رکھا ہے۔ سمجھدار انسان کا کام ہے اس زنجیر کو توڑ ڈالنا

اور آزاد ہو جانا۔ ہمارا زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ ایک اداکار کی طرح ہونا چاہیئے۔ اداکار خواہ کوئی بھی پارٹ ادا کر رہا ہو اپنی اصلی شخصیت کو جانتا ہے۔ ایسے اداکار کا مقابلہ جو اسٹیج پر بھکاری کا پارٹ ادا کرتا ہے اُس اصلی بھکاری سے کیجئے جو گلی گلی گھومتا پھرتا ہے۔ منظر تو دونوں حالتوں میں یکساں ہیں لیکن ایک شخص غریبی اور مفلسی سے لطف لے رہا ہے اور دوسرا اُسکے عذاب میں مبتلا ہے۔ اِن دونوں میں ایک آزاد ہے اور دوسرا پابند۔ اداکار کو پتہ ہے کہ اُس کی مفلسی و ناداری درحقیقت مفلسی وناداری نہیں، بھکاری کا بھیس تو اُس نے محض ناٹک کے لئے استعمال کیا ہے اسی طرح ہم لوگوں کو جب تک اپنی ذات کا علم نہ ہو جائے ہم بھکاری ہی رہیں گے ہر قدرتی طاقت ہم سے دھکا پیل کرے گی اور ہمیں اپنا غلام بنا لے گی۔ ہماری حالت اُس بادشاہ کی طرح ہے جو پاگل ہو کر گلی گلی، شہر شہر بادشاہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اصلی بادشاہ تو وہ خود ہے۔ ہم جس چیز کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں وہ ہماری اپنی ذات ہے۔ خود اعتمادی اپنی خودی کی لامحدودیت کا یقین، خودی اور خدا کی وحدت کا ملاپ ہی حقیقی نشاط و مسرت کا سرچشمہ ہے۔ یہیں آکر ہماری پیاس بجھتی ہے تشنگی مٹتی

ہے۔ اطمینان قلب حاصل ہوجاتا ہے۔ دُنیا سے کنارہ کش ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی حقیقت سے واقف ہوکر جو چاہیئے دُنیا کے ساتھ کیجیئے لیکن اس (اسٹیج پر اپنا پارٹ ادا کرتے وقت اپنی اصلیت کو کبھی نہ بھولئے۔ جولوگ بندھن میں گرفتار ہیں اُن کے لئے یہ دُنیا عقوبت و صعوبت سے بھری ہوئی ہے لیکن جن لوگوں نے اپنے بندھن توڑ ڈالے ہیں، جنہوں نے اپنی سدآزاد ذات کو پالیا ہے اُن کی نظر میں اِس کی اصل کچھ اور ہے

ویدانت کورُو سے اپنی ذات کو پانے کا مطلب صرف انفرادی طور پر رُوحانی مسرت حاصل کرنا نہیں بلکہ خود شناسی کے معنٰی ہیں تمام کائنات میں اپنی ذات کو جلوہ گر دیکھنا۔ عملی طور پر اپنے اور بیگانے کی تفریق کو مٹانا۔ اگر آدمی اپنے بھائیوں کو خدا کا زندہ وجود سمجھ کر اُن کی پوجا نہیں کرسکتا تو پھر وہ اُس خدا کی پوجا کیا کریگا جو نظروں سے اوجھل ہے اگر آپ کو خدا کا جلوہ انسانی چہرے میں، انسانی وجود میں نظر نہیں آتا تو پھر اُس کو عالم بالا کے تصورات میں آسمان کی وسعتوں میں یا بے حس اور مردہ مادے سے بنی ہوئی مورتیوں یا فرضی کہانیوں کے کردار میں کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ نہایت ہی مبارک ہوگا وہ دِن جب آپ کو انسانوں

میں ہی نہیں حیوانوں درندوں میں بھی خدا کا جلوہ نظر آئے گا اور آپ ہر چیز میں ہر طرف اُس خدا کو دیکھیں گے جو جاودانی ہے، پاک ہے، برتر ہے اور مختلف روپ دھارن کر کے مختلف شکلوں میں جلوہ نما ہے۔

جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دُنیا کا کاروبار ہماری ہی آتما کا کھیل ہے۔ تو نہ صرف ہمارے سماجی تعلقات یزدانی رنگ اختیار کر لیتے ہیں بلکہ یزدانی رشتہ ہمارا اور ہمارے خدا کا تعلق غیر مرئی حالت سے گذر کر مجسم صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ ہم کو نہ صرف باپ، بھائی، بہن اور محبوب میں اُس کا جلوہ نظر آتا ہے بلکہ ہم ان میں سے جس رشتے میں چاہیں خود خدا کو باندھ سکتے ہیں اور یہیں سے خدا کے ساتھ ماں کا رشتہ قائم ہوا ہے اور دیوی پوجا وجود میں آئی ہے۔ خدا کی پرستش خواہ کسی طریقے سے کی جائے ٹھیک ہے۔ یہ بات نہیں کہ پوجا کا کوئی خاص طریقہ ٹھیک ہے اور دوسرے تمام طریقے غلط۔ خدا کو سب طریقے منظور ہیں۔ خدا کو پانے کی جدوجہد ایک ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ خود ایک مقام سے گذر کر دوسرے مسافروں کو غلط راستے کا راہ رو قرار دے۔ اگر ہم پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے تو وہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں اور باہمی ہمدردی سے کام لیں۔ ہمیں کسی کو اپنے سے کمتر سمجھنے کا کوئی حق

نہیں۔ کمتر سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے۔ اگر ہم کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے تو ہماری نظر میں کوئی چیز کشیف ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ جو چیز ہمارے اندر ہوتی ہے وہ باہر آتی ہے۔ اگر خود ہماری ذات میں کثافت ہے تو ہمیں کسی دوسری چیز میں کثافت نظر ہی نہیں آسکتی۔ یہ ہے ویدانت کا عملی پہلو۔ کسی کو اپنے سے کمتر نہ سمجھنا۔ سب سے محبت اور ہمدردی برتنا۔ جہاں تک ہو سکے سب کو اپنی اپنی زندگی میں اِس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس طریق کار سے ہماری زندگی میں کشیدگی کم ہو جائے گی بے صبری اور بے اطمینانی دور ہونے لگے گی اور تسکین قلب اور قناعت کی بیش قیمت اور لازوال نعمتیں نصیب ہوں گی۔ ہمیں سچا آرام، سچی تسلی اور تسکین نصیب ہو گی۔



عقل معیار اور حاصل

مذہب کو وسیع النظر ہونا چاہئے اور اس لئے ہر مذہبی دعویٰ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ کسی بھی مذہب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ الہامی ہونے کی بنیاد پر دعویٰ کرے کہ اُسکے احکام کو عقل کے معیار پر پورا اُترنا لازمی نہیں۔ اگر عقل کے معیار کو مذہبی معاملات سے نکال دیا جائے تو ہمارے پاس توہمات کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ آخر عقل خواہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو اس کے ذریعہ حقیقت تک رسائی کا امکان ضرور ہو سکتا ہے کسی دوسرے وسیلے سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انسان کے لئے خدا کی ہستی سے منکر ہو جانا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی کے کہنے سے بغیر سوچے سمجھے اُس کے خدا پر ایمان لے آئے۔ ہمیں ضرورت ہے ذاتی ترقی اور نشو ونما کی ہے روحانی عرفان کی ہے انسان اگر اپنے دِماغ سے کام نہیں لیتا تو اُسے انسان نہیں کہہ سکتے۔ شعور ہی انسان کی خاصیت ہے۔ سوچنا سمجھنا انسان کی فطرت میں

داخل ہے اور یہی وہ بات ہے جو اُسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج انسانی فہم فراست نہایت ہی مضحکہ خیز استعمال کی جا رہی ہے۔ عجیب عجیب نظریئے پیش کئے جا رہے ہیں، نئے نئے فلسفانہ نظام قائم ہوئے ہیں اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسانی اِرتقا کی رفتار رُک گئی ہے۔ ایک طرف تو لوگ رسم ورواج کے پابند ہو کر لکیر کے فقیر بن گئے ہیں اور دوسری طرف عقل فراست، دقیانوسی نظریوں کے منطق کے سلسلے میں جکڑ گئی ہے۔ لیکن اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو ہمیں بہتے ہوئے پانی کی طرح تر و تازہ رہنا ہے اور تالاب کا رُکا ہوا پانی نہیں بننا ہے۔ آج لوگ مذہب کے نام سے دُور بھاگتے ہیں اور اُسے پنڈتوں، پادریوں اور مولویوں کا پاکھنڈ سمجھتے ہیں۔ بہت سے لوگ بظاہر اپنے مذہب پر اعتماد رکھتے ہیں لیکن در اصل اُن کے دِل میں بھی بے اعتمادی زیادہ پائی جاتی ہے۔ مذہب اب ظاہری شناخت کی علامت ہے کیونکہ جو مذہب ہمارے آباؤ اجداد کی روحانی پیاس بجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا وہ زمانہ حال کی رُوحانی ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہے اُس لئے نہیں کہ رُوحانی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ اس لئے کہ انسانی اِرتقا کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکی۔ اب انسان

کی عقل اپنے باپ دادا کے مذہب کو قبول نہیں کرتی اِس سے اُن کے دِل کو تسلی نہیں ہوتی۔ آج سچا مذہب وہی ہے جو عقل وخرد سائنس اور دلیل پر پورا اُتر سکے۔ ہمیں عقل سے زیادہ سے زیادہ کام لینا ہوگا اور معقولیت کے معیار کو پانا ہوگا اور ایسا کر کے ہم دیکھیں گے کہ وحدت الوجود ہی کا ایک ایسا نظریہ ہے جو دوسرے تمام نظریوں کے بمقابلہ زیادہ معقول ہے اور اُسے عقل قبول کرتی ہے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دِماغ کا دائرہ بہت محدود ہے اور جن کو اپنی ترقی کے لئے ایسی زود فہم اور آسان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن پر وہ آسانی سے عمل کر سکیں۔ ایسے لوگ رُوحانی بلند پروازی کی جرأت ہی نہیں کر سکتے اُن کے لئے تو بس دیوی دیوتا۔ اوتار پیغمبر فرشتے وغیرہ کے خیالات کار آمد اور مفید ہوتے ہیں۔ لیکن ذہین لوگوں کے لئے غیر شخصی خدا کے وجود کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

وحدت الوجود کا نظریہ

وحدت الوجود کا نظریہ کہتا ہے کہ یہ عالم کائنات محض اُسی ذات مطلق کی ہستی کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر ہے۔ یہ وضاحت ایسی ہے کہ جس سے ساری عقل اور ہمارا دِل دونوں مکمل طور پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ

اس کی رو سے عالم کائنات میں جو بھی چیز نظر آتی ہے یہاں تک کہ شخصی خدا کا تصور بھی در حقیقت ایک ہی غیر شخصی وجود ہے جسے ہماری خودی نے محدود کر رکھا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک برگد کا پیڑ جو کئی ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہوتا ہے ایک چھوٹے سے بیج جو رائی کے دانے کے آٹھویں حصے کے برابر ہوتا ہے اندر ہوتا ہے۔ ساری طاقت اس بیج کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے یہ زبردست عقل اور ذہانت تخم پیدائش کے ایک خانے میں سموئی ہوتی ہے، اگر یہ ممکن ہے تو کیا لا انتہا طاقت انسان کے آتما یا رُوح میں موجود نہیں ہو سکتی؟ موجود ہے اور انسان اِس طاقت کو اُس وقت محسوس کرتا ہے جب اُسے آتما کا شعور ہو جاتا ہے۔ جونہی ہمیں آہستہ آہستہ اپنی آتما کا احساس ہونے لگتا ہے ایک بے پایاں طاقت ہمارے اندر بیدار ہونے لگتی ہے جیسے کوئی سویا ہوا دیو عظیم رفتہ رفتہ جاگ اُٹھا ہو۔ جوں جوں احساس بیداری کی شدت بڑھتی جاتی ہے غنودگی کے بندھن کھلتے جاتے ہیں اور غفلت کی زنجیروں کی کڑیاں ٹوٹتی چلی جاتی ہیں اور پھر ایک دِن یقیناً ایسا آجاتا ہے جب ہم اپنی لامحدود طاقت اور بے کنار عقل دانش سے مکمل طور پر آگاہ ہو کر اپنے پاؤں پر آزاد و سربلند کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آیئے اس منزل پر جلد از جلد پہنچنے کی غرض سے ہر ممکن کوشش کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔



احساس

جسم کا شعور مٹنے پر رُوح کا احساس ہوتا ہے اور رُوح کا احساس باقی نہ رہنے پر جسم کا شعور اُبھرتا ہے۔ جب انسان رسّی کو سانپ سمجھ لیتا ہے تو رَسّی کا وجود غائب ہو جاتا ہے اور جب وہ رسّی کو رسّی سمجھتا ہے تو سانپ کی ہستی مِٹ جاتی ہے اور صرف رسّی کا وجود باقی رہ جاتا ہے۔

ویدانتی نظریہ کے مطابق رُوح ایک عالم گیر غیر متغیر اور لافانی ہستی ہے جس کی ہستی "حیثیت" "کُل" کی ہے۔ جہاں تک "کُل" کا تعلق ہے ہم لافانی ہیں "کُل" کی حیثیت سے نہ کہیں ہماری ابتدا ہے اور نہ انتہا اور یہی ہماری حقیقی خودی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اپنی جزوی انفرادیت کو رُوح کا درجہ دے کر رُوح کو بھی منفرد بنانا چاہتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہماری جزوی انفرادیت میں اِرتقا کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور ہماری شخصیت بدلتی رہتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اُسی

طرح بالیدگی کے عمل سے گذرتا ہے۔ پہلے خام تصورات میں زندگی بسر کرتا ہے اُن سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور پھر بلند ترین معیار پر پہنچتا ہے۔ مذہب کے معاملے میں اپنے سے پہلے نظریوں اور رسم و رواج کو کلیتاً مسترد کر دینا سماج کے لئے ہمیشہ سخت نقصان دہ رہا ہے۔

دویت واد اور ادویت واد

دویت واد کی رو سے رُوح یا آتما ایک مکمل مگر محدود اور منفرد ہستی ہے لیکن ادویت واد یعنی ویدانت اس کے خلاف آتما اور پرماتما میں کوئی فرق نہیں رکھتا۔ دویت واد کے مطابق آدمی مرنے کے بعد دوسری دُنیا میں جاتا ہے لیکن ویدانت یعنی ادویت واد کسی جنت یا دوزخ کا قائل نہیں۔ دوئی کا ایک اور بنیادی اُصول ہے کہ دُنیا کی تخلیق محض مادہ یا شکتی سے ہوئی ہے اور اُسے کسی ایسے خالق نے اپنی قوت ارادی یعنی مرضی سے تشکیل دیا ہے جو خود اسی کائنات سے باہر ہے اور اُس لحاظ سے انسان اپنے خالق سے علیحدہ ہے اور اس کی یہ علیحدگی یا انفرادیت قائم رہے گی۔ لیکن ویدانت یا ادویت واد نے اس نظریئے

سے آگے اُڑان کی ہے وہ اِس من تو کے نظریئے کو مسترد نہیں کرتا لیکن اس ایسے آگے ''من وتو'' کے درمیان ''وٗ'' قائم نہیں رکھتا۔ گویا ادویت واد کا فلسفہ ہے من خدا۔

دوئی کے فلسفے کے مطابق انسان کی سرشت میں دو جزو شامل ہے۔ یعنی ایک رُوح اور دوسرا جسم۔ رُوح منفرد ہے مگر بذات خود مکمل۔ رُوح زندہ جاوید ہے۔ جسم کی موت کے ساتھ اس کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔

بخلاف اس کے جسم فانی ہے لیکن جسم سے وابستہ ایک غیر مرئی لطیف جسم (سوکھستم تغزیر) ہوتا ہے۔ یہ جسم لطیف مادے سے بنا ہوا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بہت لطیف ہوتا ہے۔ یہ جسم ہمارے تمام کرموں کا محرک بھی ہے اور مسکن بھی ہمارے تمام اعمال د تاثرات ہمیشہ ٹھوس صورت میں یعنی لباس مجاز میں نمودار ہونے کے لئے آمادہ اور بے قرار رہتے ہیں اور اِسی جسم لطیف کے اندر لطیف صورت میں موجود رہتے ہیں۔

جو خیال بھی ہمارے دِل میں گذرتا ہے، جو کام بھی ہم کرتے ہیں ایک خاص مدت کے بعد وہ ایک لطیف شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہمارے اعمال کی یہ امکانی صورتیں اپنے اظہار کے لئے خود موافق حالات پیدا کر لیتی ہیں اور نتائج ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور اِن نتائج کے مطابق ہی ہماری زندگی بنتی یا بگڑتی ہے۔ اسی کو کرموں کا بندھن کہتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو خود ہی اپنے اعمال کے سانچے میں ڈال لیتے ہیں ہمارے یہ تمام بندھن خودساختہ ہیں۔ ہماری مجبوریاں خود ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ جس چیز کو ہم قانون قدرت کہتے ہیں وہ بھی ہمارا ہی بنایا ہوا ہے۔ ہمارے خیالات، ہمارے الفاظ اور ہمارے اعمال ہی وہ دھاگے ہیں جن سے خود ہم اپنی مجبوریوں کا جال بُنا کرتے ہیں۔

ہمارے اس جسم لطیف یا سوکھشم شریر کے پس پردہ جیو یا رُوح کا قیام ہے۔ بعضوں کے خیال میں یہ رُوح ایٹم یا جوہر کی طرح ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے اور بعض اس کو اتنا چھوٹا قرار نہیں دیتے۔ کچھ لوگوں کی رائے میں یہ جسم اور جسامت کے لحاظ سے بہت بڑی ہوتی ہے۔ یہ جسم یا رُوح ایک آفاقی یا کائناتی جوہر کا ایک جزو ہے اور اس جزو کا وجود بھی دوامی ہے۔ اس کے وجود کی نہ کہیں ابتدا ہے اور نہ کہیں انتہا۔ یہ اِن سب صورتوں سے اس لئے گذر رہا ہے کہ اس طریقے سے

حقیقی فطرت کا اظہار ہو سکے۔اور یہ حقیقی فطرت ہے صدق وصفا اور پاکیزگی۔جس عمل اور خیال سے اس کے اظہار میں خلل واقع ہوتا ہے اُس کو گناہ یا بدعمل کہتے ہیں اور جس عمل اور خیال سے اس کے اظہار میں مدد ملتی ہے اُسے ہم نیک عمل یا ''ثواب'' قرار دیتے ہیں۔

دویت وادیوں اور ادویت وادیوں یا دوگانہ وجود ماننے والوں اور وحدت پرستوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے رُوح کے تمام امکانات اور اس کی تمام قوتیں خود اس کے اندر موجود ہوتی ہیں۔کہیں باہر سے نہیں آتی۔ادویت وادی اور دویت وادی میں سب سے بڑا فرق ہے کہ دویت وادی رُوح کی بے انتہا قوت کے قائل ہیں۔وہ آواگون یا نتائج کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ ہماری زندگی کا مقصد کسی عالم بالا میں سکھ یا چین سے رہنا ہے۔ جاودانیت اور سرور بھی ایسی چیزیں نہیں جنہیں حاصل کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ دونوں چیزیں بھی پہلے سے ہمارے قبضے میں ہیں۔ اگر آپ میں بہ آواز بلند یہ اعلان کرنے کی جرأت ہے کہ آپ آزاد ہیں تو آپ فی الفور آزاد ہو سکتے ہیں اور اگر آپ اپنے کو پابند قرار دیتے ہیں تو آپ پابندی ہی رہیں گے۔

عملی ویدانت کا پہلا اُصول یہ ہے کہ پہلے آپ جو چیز آپ اپنے لئے موزوں سمجھتے ہیں اُسے قبول کیجئے لیکن یہی حق دوسروں کو دیجئے۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ کسی کے نصب العین پر اعتراض کریں یا اُسے ہیبت ناک قرار دیں۔ یہ تو اپنے اپنے آدرش کا سوال ہے۔ آپ اپنی ہستی کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کیجئے۔ آپ کی خواہشات آپ کی انفرادی ہستی کی تشکیل کرتی ہے۔ جب تک آپ میں اپنی محدود زندگی کی خواہش باقی رہے گی آپ کی پوشیدہ قوت غیر شعوری طور پر آپ کو محدودیت کے دائرے میں محدود رکھے گی۔ جتنی زندگی بسر کرنے کی آرزو آپ کے دِل میں ہوگی ویسی ہی زندگی آپ کے حصے میں آئے گی۔ اگر آپ فرشتہ بنا چاہئیں تو فرشتہ بن سکتے ہیں یہی قانون فطرت ہے۔ لیکن اس دُنیا میں ایسے شخص بھی ہیں جس کو فرشتہ بننا منظور نہیں۔ وہ نام اور رُوپ کے تمام قیود سے آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اُن کے نصب العین پر اعتراض کریں یا اُسے ہیبت ناک قرار دیں۔

انسان جس قدر زور انفرادیت پر دیگا اتنا ہی خودغرض بھی ہوگا اور اُتنا ہی دھرم اور اخلاق سے دُور رہیگا۔ اپنی جسمانی خودی کا تحفظ ہی

درحقیقت خودغرضی ہے۔ جن اخلاقیات کی بنیاد اِس خودی کے تحفظ پر رکھی جائے گی وہ چاہے کچھ بھی ہو اخلاقیات نہیں ہو سکتی۔ ہر قسم کی خیر و فلاح اور اخلاقی تقاضا ہے کہ ''میں'' سے پہلے ''آپ'' ہو۔ یعنی اپنے سے پہلے دوسروں کا خیال کرنا چاہئے۔ جہاں اس اُصول پر عمل ہوتا ہے وہاں حقیقی طور پر مذہب کی پیروی ہوتی ہے۔ ایک انسان کو چاہے وہ ہندو، مسلمان ہو، سکھ ہو، عیسائی ہو سب سے پہلے جو سبق سیکھنا چاہئے وہ اپنے پندارِ خودی کو مٹا کر اُس کی جگہ پندارِ خدا کو دیں۔ محدودیت کے قید خانہ سے نکل کر لامحدودیت کی فضا میں آ جایئے، تبھی آپ سچے دِل سے مذہب کے اُصول پر چل سکتے ہیں۔ نیکی اور بدی محبت اور نفرت ترک اور خودغرضی کے وجود کا انحصار ہماری وسعت نظر پر ہے۔ یہ جتنی وسیع ہوتی جائے گی ہمارا دِل جتنا کشادہ ہو جائے گا، اتنا ہی ہمارے کردار میں نیکی محبت اور ترک خودی کا ظہور ہوتا جائے گا اور انجام کار نیکی ہی نیکی۔ محبت ہی محبت کا دور دورہ ہو گا ہماری اصل محبت نیکی ہے۔ نفرت محبت کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ بدی دراصل نیکی کی طاقت کا غلط استعمال ہے۔ دُنیا میں دو متوازی طاقتیں پہلو بہ پہلو کام کر رہی ہیں۔ ایک ہے ''میں'' کی طاقت اور دوسری ہے ''میں نہیں'' کی

طاقت۔ ایک میں اخذ و اختیار سے دوسرے میں ترک و ایثار۔ ایک طاقت دوسروں سے کچھ لیتی ہے اور دوسری طاقت دوسروں کو کچھ دیتی ہے۔ ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ کائنات کی تخلیق و تحریک کے سبب دو ہیں۔ یعنی یزدانیت اور شیطانیت۔ ایک سبب ہے نیکی اور دوسرا بدی۔ ایک سبب ہے محبت اور دوسرا نفرت۔ یہ غلط ہے۔ اگر ہم ایک خدا کو مانتے ہیں تو یقیناً محبت کی واحد طاقت نظر آئے گی۔

اعلیٰ ترین اخلاقیات فلسفہ و سائنس کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہی نشو و نما پا سکتی ہے۔ علم آگہی سے اخلاق بلند ہوتا ہے۔ علم وہ چیز ہے جو ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر غلط رویے سے بچا سکتا ہے۔ علم بذات خود پرستش ہے۔ جتنا وسیع ہمارا علم ہوگا اُتنا ہی بلند اخلاق۔ ویدانت کی رُو سے وہ چیزیں بھی بظاہر بری ہیں درحقیقت بری نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم نے لامحدود کو محدود کر رکھا ہے۔ محبت جو چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہ کر عذاب بن جاتی ہے اپنی بندشوں سے نکل کر بالآخر یزدانیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تمام برائیوں اور عذابوں کے ذمہ دار ہم خود ہیں اور اُس کا علاج بھی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ کسی مافوق الطبع ہستی پر تہمت لگانا اتنا ہی فضول اور بے معنی ہے جتنا مایوس ہو

کر ہمت ہار کر بیٹھے رہنا۔ ہم لوگ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے ہی اندرونی مواد سے اپنے گرد دھاگا بناتے ہیں۔ نجات کا واحد طریقہ ہے خود اعتمادی۔ جس چیز کی لگن سچے دِل سے ہوگی وہ پوری ہو کر رہے گی۔ ہم اپنے حال و مستقبل کے معمار خود ہیں۔ ہم سے غلطی اس لئے سرزد ہوتی ہے کہ ہم اپنے کو کمزور سمجھتے ہیں۔ یہ کمزوری کا احساس ہماری کم فہمی اور کم نظری کا نتیجہ ہے۔ نیکی اور پاکیزگی ہماری فطرت میں داخل ہے۔ لیکن ہم اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلاتے ہیں کہ ہائے ہر طرف اندھیرا ہے ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ ضرورت ہے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لینے کی پھر روشنی ہی روشنی نظر آئیگی۔ قوت اِرادی سب کچھ کر سکتی ہے۔ نیکی، نیکی کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ضرورت ہے اپنے کریکٹر (کردار) کو بلند کرنے کی اور قوت اِرادی کو مضبوط کرنے کی۔ ہم جہاں بھی رہیں اپنی حقیقت سے آگاہ ہو کر رہیں اور یہ حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ ہم پاک اور متبرک ہیں، ہمارا وجود، وجود تاباں ہے ہم مجسم نیکی ہیں۔



کرم یوگ

ویدانت کا سب سے عظیم الشان نظریہ ہے کہ ہم مختلف روحانی راستوں پر چل کر ہی منزل مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ مختلف راستے چار ہیں یعنی کرم (کام) بھکتی (عشق و عبادت) نفسیات اور گیان (یعنی معرفت)۔ لیکن یہ تقسیم کچھ ایسی نہین کہ انہیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کر کے دکھایا جا سکے۔ ہر راستہ دوسرے سے ملا جلا ہوا ہے۔ کبھی ایک عنصر غالب نظر آتا ہے تو کبھی دوسرا۔ تقریباً ہر انسان میں کرم، گیان، نفسیات اور بھگتی کے عنصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ کسی میں ایک غالب ہوتا ہے تو کسی میں دوسرا۔ کوئی دست بازو کی قوت پر تکیہ کرتا ہے تو کوئی دماغی زور سے زندگی کو سمجھنا چاہتا ہے۔ کوئی عشق و محبت کی خود سپردگی سے خدا تک پہنچتا ہے تو کوئی مابعد الطبعیاتی طاقتوں کو حاصل کرتا ہے۔ جیسی جیسی کسی کی طبیعت کی افتادگی ہوگی ویسا ہی روحانی راستہ وہ اختیار کریگا۔ بالآخر یہ تمام

راستے ایک ہی مقام پر جا کر مل جاتے ہیں۔ دُنیا میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں، کام کاج اور پوجا پاٹھ کے جیسے بھی طریقے عاید یا مستعمل ہیں سب کے سب ایک ہی منزل پر لے جاتے ہیں اور یہ منزل مقصود ہے مکمل آزادی۔ مکمل آزادی حاصل کرنے کی لگن کائنات کے ہر ذرّے میں موجود ہے اور جب کسی شخص کو یہ مکمل آزادی حاصل ہوجاتی ہے تو اُس کو لاانتہا وسعت حاصل ہوتی ہے۔ اُس کی چھوٹی سی انفرادی شخصیت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجاتی ہے۔ اس لامحدودیت کا حاصل کرنا ہی تمام مذاہب کا تمام اخلاقیات کا اور تمام فلسفیانہ تعلیمات کا واحد مقصد ہے۔ بہر حال نظریہ کچھ بھی ہو مقصد ایک ہی ہے۔ منزل ایک ہی ہے۔

کرم یوگ بے غرضانہ عمل کے ذریعے اس منزل یا اس مقام کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ ہمارا ایسا ہر عمل جو خود غرضی کے تحت ظہور میں آتا ہے حصول نجات میں سدراہ ہوتا ہے اور ہمارا بے غرضانہ عمل ہم کو اس مقصد تک پہنچانے میں دلیل رہ بن جاتا ہے۔ جس فعل کا دار مدار بے غرضی پر ہوتا ہے وہ اخلاقی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن جس میں خود غرضی شامل ہو وہ غیر اخلاقی ہے۔ انسان کو اپنے پن کا اپنی خودی کا شعور

اور احساس تو بس اُسی وقت تک ہوتا ہے جب تک وہ اپنے غرض کے لئے سوچتا ہے عمل کرتا ہے یا کچھ کہتا سنتا ہے۔ اگر اُس کو اپنے پن کا احساس ہی نہ رہے اور اُس کی زندگی دوسروں کے لئے وقف ہو جائے۔ اگر اُس کی خودی پھیل کر سب کو اپنے میں سمو لے۔ اگر تمام عالم کائنات اُس کی اپنی ہستی میں مدغم ہو جائے تو اُس کی انفرادی شخصیت کا وجود ہی کہاں رہتا ہے۔

کرم یوگ مذہب یا اخلاقیات کے اُسی طریقہ کار کو کہتے ہیں جس کے تحت بے غرض اور نیک اعمال کے ذریعے انسان نجات یعنی مکمل آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ کرم یوگی کا تو بس ایک مقصد ہے اپنی خودی یعنی خود غرضی سے بیگانہ ہو جانا۔ کرم یوگی کام کرنے کا وہ طریقہ دریافت کر لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ دُنیا کے کاروبار میں تو ضرور لگا رہتا ہے لیکن وہ کام کرنے کا وہ راز دریافت کر لیتا ہے جس کے ذریعہ کام بھی ہوتا رہتا ہے اور وہ خود کام کا غلام بھی نہیں رہتا۔ گویا کرم یوگ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دُنیا کی اِس مشینری کے چکروں میں داخل ہو کر بھی انسان کچھ اس طرح چل سکتا ہے کہ خود اس مشینری کی طاقت سے کام لیتے ہوئے باہر نکلنے کی صورت بھی نکل سکتی ہے۔ کرم یعنی کام اُس حرکت کا

نام ہے جس سے اس تمام عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ کرم ہی پر تمام دُنیا کی اساس رکھی ہوئی ہے۔ فطرت کرم ہی کے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے۔ کرم یوگ وہ فلسفہ حیات ہے جس کے مطابق خود کرم ہی کو ذریعہ نجات بنایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم دُنیا کا کاروبار سر انجام دیتے ہوئے بھی آزادی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ نجات ہماری اِرتقا کا نام ہے۔ کرم یوگ کہتا ہے کہ کام کرنا آپ کی فطرت ہے۔ آپ کو کام کرنے کا اختیار ہے لیکن کام کے پھل پر آپ کا کوئی حق نہیں۔

To work you have the right

But not to the fruit thereof

اس طرح ہر آدمی اس اصول پر عمل کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے۔ جب دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کا خیال کرم یوگی کی زندگی کا جزو بن جاتا ہے تو پھر اُس کو بیرونی محرکات عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ نیکی کیجئے کیونکہ نیکی کرنا بجائے خود اچھا ہے۔ نیکی اپنا انعام آپ ہے۔ اسی لئے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہر کام کے نتیجے یا پھل کی خواہش کا ترک کر دینا۔ صرف کام کرنا۔ اس کے نتیجے پر نظر نہ رکھنا۔

نیکی کیجئے اور نیک بنئے۔اسی کے ذریعہ آپ کی رسائی حق و صداقت کی آخری منزل تک ہوسکتی ہے۔



مقصد اور معیار

ہر قسم کا عمل کرم کہلاتا ہے۔ بنی نوع انسان کی منزل مقصود علم ہے اور علم ایک داخلی نعمت ہے۔ ہم جو بھی کام دِماغ اور جسم سے لیتے ہیں وہ کرم ہے اور اس کرم کا ایک نقش ہمارے دِل و دِماغ پر قائم ہو جاتا ہے۔ زندگی میں بعض ایسے عظیم مواقع آتے ہیں کہ ایک چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی جوش میں آ کر بڑے بڑے کام کر گزرتا ہے۔ لیکن بڑا آدمی در حقیقت وہی ہوتا ہے جس کے کردار میں ہمیشہ اور ہر وقت عظمت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

کرم وہ زبردست قوت ہے جس کی وساطت سے انسان اپنے کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ کردار سے عزم بنتا ہے اور اس طرح جیسا کرم ہوتا ہے اُسی کے مطابق انسان کا عزم بھی بن جاتا ہے۔ دُنیا میں جو لوگ زبردست قوت ارادی اور عزم مصمم کے مالک ہوئے ہیں۔ اُنہیں کی ذات سے بڑے بڑے معرکہ آرا کام سر انجام پائے ہیں۔ قوت

ارادی کی تشکیل بذاتِ خود کرم سے ہوتی ہے۔ کرم سے ہی دُنیا کی ہر چیز کا تعین ہوتا ہے۔ ہم جس کے مستحق ہوتے ہیں یعنی جس چیز کو ہم اپنا سکتے ہیں اُس کا تعین کرم سے ہوتا ہے یا ہم جو کچھ ہیں اُس کی ذمہ داری ہم ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اور جیسا ہم بننا چاہتے ہوں ویسا بننے کی طاقت ہمارے اندر موجود ہے۔ ہم اس وقت جس حالت میں ہیں وہ نتیجہ ہمارے گذشتہ اعمال کا ہے اور اسی طرح ہم جو کچھ آئندہ ہونا چاہیں گے وہ نتیجہ بھی ہمارے موجودہ اعمال کا ہوگا۔ ہم اپنی تقدیر کے آپ مالک ہیں۔ اسی لئے ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کام کرنے کا صحیح انداز کیا ہے؟۔ کام کس طرح کرنا چاہیئے؟۔ مناسب اور صحیح طریقہ سے ہی کام کرنے کا نام کرم یوگ ہے۔ بلکہ گیتا میں لکھا ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ اور طریقے سے کام کرنے کا نام ''کرم یوگ'' ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کام کرنے سے صرف فوری نتائج ہی مطلوب نہیں ہوتے۔ اصل مطلب اور مقصد تو یہ ہے کہ ہمارے دِماغ کے اندر جو طاقت در پردہ کام کر رہی ہے وہ نمایاں ہو جائے۔ ہمارے رُوح بیدار ہو جائے۔ علم و معرفت کا خزانہ ہر شخص کے دِل میں ہے۔ ہم یہ جو مختلف کام کرتے ہیں اُن کا مقصد خوابیدہ طاقتوں کو جھنجھوڑ کر جگانا ہے۔

انسان مختلف مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام کرتا ہے۔ مقصد یا غرض کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ بعض اشخاص شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض روپے کی خواہش سے کام کرتے ہیں۔ بعض اقتدار اور اختیار کے متمنی ہوتے ہیں۔ بعض جنت کے طلب گار ہوتے ہیں اور وہ حصول جنت کے لئے نیک اعمال سے کام لیتے ہیں۔ بعض اشخاص کفارے کے طور پر کام کرتے ہیں، پہلے تو طرح طرح کی بداعمالیوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور اُس کے بعد کوئی عبادت گاہ بنوا دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے کفارے سے اُن کے نامۂ اعمال کی کثافت دُور ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ آدمی کچھ اس قسم کے مختلف اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کام کرتے ہیں۔ لیکن دُنیا میں ایسے عظیم انسان بھی ہوتے ہیں جو محض کام کی خاطر کام کرتے ہیں۔

اُنہی لوگوں سے انسانیت کا معیار بنا رہتا ہے۔ ہر بیدار ملک اور ہر زندہ قوم میں ایسے آدمی ضرور نظر آئیں گے۔ نہ اُنہیں نام کی ہوس ہوتی ہے اور نہ شہرت کی تمنا اور نہ ہی وہ جنت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ وہ کام محض اس خیال سے کرتے ہیں کہ اس سے کچھ نہ کچھ خیر و فلاح کی

صورت پیدا ہوگی۔ اُن سے بھی بلند مقام وہ انسان ہیں جو بھلائی اور بہبودی کے کام محض اس لئے کرتے ہیں کہ اُن کی نظر میں نیکی اور بھلائی خود اپنا انعام آپ ہے۔ یہ لوگ نیکی اور بھلائی میں ہی ایمان رکھتے ہیں۔ اور اسی کو زندگی کا اعلیٰ مقصد شمار کرتے ہیں۔ یہ لوگ غریبوں کی بھلائی اور مدد محض اس لئے نہیں کرتے کہ ایسا کرنا نیکی میں داخل ہے بلکہ وہ دوسروں کے کام اس لئے کرتے ہیں کہ بھلائی کرنا اُن کے ایمان کا جزو ہے اور وہ بھلائی پسند کرتے ہیں۔ دراصل یہی لوگ کام کے راز سے واقف ہیں اور باقی سب کام کی غلامی کرتے ہیں۔ ہم کام کے غلام اس طرح ہوتے ہیں کہ اگر ہم فلاں کام نہیں کریں گے تو ہمارا فلاں نقصان ہوگا۔ لیکن بے غرض کام بذاتِ خود ایک نعمت ہے۔

اگر کوئی شخص پانچ دِن یا پانچ منٹ بھی ہر قسم کی ذاتی غرض سے بلند ہو کر اس طرح کام کرتا ہے کہ اُس کو مستقبل کی کوئی پرواہ نہیں رہتی اور نہ اُسے کوئی جنت کی طلب ہوتی ہے نہ ہی سزا کا خوف ہوتا ہے تو اُس میں ایک نہ ایک روز فقط خیال سے ایک نہایت ہی عظیم الشان ہستی بن جانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ضبطِ نفس بجائے خود ایک زبردست قوت کا مظہر ہے، بلکہ ضبطِ نفس دوسرے تمام خارجی اعمال کے بمقابلہ

کہیں زیادہ طاقت کا مظہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک چار گھوڑوں والی گاڑی کو لے لیجئے۔ اگر اُن گھوڑوں کو ایک پہاڑی ڈھلوان سڑک پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سرپٹ بھاگتے ضرور چلے جائیں گے۔ اس میں طاقت کا اظہار ضرور ہے۔ لیکن اگر اِن میں ایک سائنڈ لگام لگا کر قابو میں رکھے اور اپنی مرضی کے مطابق چلائے تو اس میں زیادہ طاقت کا مظہر ہوتا ہے۔ پہلی حالت میں بے لگام طاقت موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے اور دوسری حالت میں ضبط تحمل سے طاقت کا صحیح اور مفید استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی محنت کرتا ہے اور صبر و تحمل سے کام کرنا سیکھ لے اور کچھ عرصہ چپ چاپ کام کئے جائے اور دوسروں پر حکومت کرنے کا احمقانہ خیال چھوڑ دے تو اُسے صبر و انتظار کا پھل ضرور ملے گا۔

معیاری انسان تو وہی کہلائے گا جو انتہائی خاموشی اور تنہائی کے عالم میں زندگی کے شور وغل سے غافل نہ رہے اور جس کو عمل کی انتہائی سرگرمی کے دوران جنگل کی خاموشی اور تنہائی محسوس ہو۔ ایسے ہی شخص کو ضبط وتحمل کا راز معلوم ہوتا ہے اور اُسی نے خود پر قابو حاصل کرلیا ہے۔ ایسا شخص نیک بڑے بڑے شہروں کی آمدرفت کی سرگرمی سے بھری ہوئی

سڑکوں سے گذرتے ہوئے بھی ویسا ہی سکون پاتا ہے جیسا غاروں میں رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسا شخص جنگل اور صحرا کی خاموشی میں بھی نکما نہیں بیٹھتا بلکہ ہر وقت نہایت مستعدی سے کام میں مصروف و منہمک رہتا ہے۔ اخلاق و ثواب و فراخ دِلی و وُسعت نظری کا ہی دوسرا نام ہے۔ جس کام میں کم ظرفی، تنگ نظری اور کمزوری ہو اُسے گناہ سمجھئے۔ دراصل گناہ کمزوری ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اگر آپ میں کسی شخص کو امداد کرنے کی طاقت ہے تو آپ گناہ سے کوسوں دور ہیں۔ لیکن امداد کرتے وقت یہ سوچنے کی زحمت مت اُٹھائیے کہ اس کام کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کام کرتے وقت کام کرتے چلے جایئے۔ اپنی طاقت کو استعمال میں لاتے جایئے۔ ہم بے غرضی کے ساتھ کام کرتے ہوئے زندگی کی مختلف راہوں میں کشمکش کرتے ہوئے آخر اُس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں ہماری طاقتیں سمٹ کر ایک مرکز پر آجائیں گی اور ہمیں اپنی پاک ذات میں تمام علم و آگہی کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔



ست چت آنند

عطیہ

ہماری مصیبتیں ہمیشہ کے لئے روحانی علم سے دُور ہو سکتی ہیں۔
رُوحانی امداد ہی انسان کے لئے سب سے زیادہ مکمل اور اعلیٰ امداد ہے۔
نوع انسان کا سچا اور عظیم ترین محسن وہی ہے جو انسان کو رُوحانی علم کی
دولت سے مالا مال کرتا ہے۔

رُوحانی امداد سے اُتر کر ذہنی معاونت کا مقام آتا ہے۔ گیان یا
علم کا عطیہ غذا اور پوشاک کے عطیوں سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہوتا
ہے۔ یہ عطیہ کسی مردہ جسم میں جان ڈالنے سے بھی بڑھ کر گراں منزلت
ہوتا ہے کیونکہ انسان کی حقیقی زندگی علم ہی میں مضمر ہے۔ جہالت موت
ہے اور علم زندگی۔ اگر زندگی تاریکی میں بسر ہو، جہالت اور مصیبت کی
وادیوں میں بھٹکتی ہو تو اس کی کوئی قدر قیمت نہیں۔ ذہنی معاونت کے
بعد ہی انسان کی مادّی امداد کا درجہ آتا ہے۔ لیکن صرف مادّی مدد ہی

آخری مدد نہیں ہوتی بلکہ اس کی اہمیت تو نہایت ہی کم ہے۔ مختلف قسم کی اذیتوں سے نجات صرف مادّی مدد سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان کی فطرت میں انقلاب رُونما نہیں ہوتا اُسے جسمانی ضروریات پیش آتی رہتی ہیں اور تکمیل آرزو نہ ہونے پر قسم قسم کی اذیتوں کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس صورت میں چاہے جتنی بھی مادّی امداد سے کام لیا جائے یہ اذیتیں دفع نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلے کا واحد حل تو یہی ہے کہ انسان میں پاکیزگی پیدا کی جائے۔ اُس کو حقیقت سے آشنا اور اپنی رُوحانی طاقت سے آگاہ کیا جائے۔ خواہشات کی ظلمتیں تب ہی دُور ہو سکتی ہیں جب رُوحانیت کی روشنی چاروں طرف پھیلا دی جائے۔

کرم چاہے کچھ بھی ہو امداد چاہے ہم کسی کی رُوحانی، علمی یا مادّی کریں لیکن اُن کا کوئی گہرا نقش ہمارے رُوح پر نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے اعصاب اور دِماغ سے بڑے بڑے کام لینے ضرور چاہئے لیکن ہمیں خود کو کسی چیز سے وابستہ نہیں کرنا چاہئے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ ہم اس دُنیا میں ایک اجنبی ہیں، ایک جہاں گرد سیاح ہیں۔ اپنے مختصر قیام کے دوران خوب دیکھئے، برابر کام میں مصروف رہئے لیکن خود کو اس سے وابستہ نہ کیجئے۔ یہ وابستگی بڑی ہولناک چیز ہے۔ یہی ہماری غلامی

کا باعث بنتی ہے۔ دُنیا ہمارا مسکن نہیں ہے۔ یہ تو اُن متعدد منازلات میں سے ایک منزل ہے جن سے ہو کر ہمیں گذرنا پڑتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تمام کائنات رُوح کے لئے ہے لیکن رُوح کائنات کے لئے نہیں۔ کائنات کا وُجود رُوح کی تعلیم کے لئے ہوتا ہے۔ قدرت ایک کتاب ہے جس کا مطالعہ کرنا ہے۔ اور جس وقت بھی ہمیں مطلوبہ علم حاصل ہو جائے گا یہ کتاب ہمارے لئے کسی کام کی نہ رہے گی لیکن اس کے باوجود ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ رُوح کا وجود جہاں کے لئے ہے۔ ہم رُوح کو اس گوشت پوست کے ڈھانچے کا غلام سمجھنے لگتے ہیں۔

گویا خلاصہ یہ ہے کہ غلام کی حیثیت سے نہیں آقا کی حیثیت سے کام کرو۔ کام ضرور کرو۔ خوب کرو، دِل لگا کر کرو لیکن غلام بن کر نہیں۔ اور جس کام میں غرض شامل ہے وہ غلامی ہے۔ کام کر پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے۔ آزاد ہو کر محبت سے جو کام کیا جاتا ہے۔ اُس سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ محبت کا کوئی ایسا کام نہیں ہوتا جس سے امن وسکون حاصل نہ ہو۔ محبت کے ہر کام میں برکت شامل ہوتی ہے۔ حقیقی وجود، حقیقی علم اور حقیقی محبت ہستی کے یہ تینوں اجزاء ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ دراصل یہ تینوں

ایک ہی چیز ہیں۔ جہاں ایک جزو موجود ہے وہاں دوسرے کا بھی ہونا لازمی ہے۔ یہ ایک لاشریک اور لاثانی ہستی کے تین پہلو ہیں۔ اُسی کو ''ست چِت آنند'' کہتے ہیں۔ یہ حقیقی وُجود، حقیقی علم اور حقیقی سرور کا مجموعہ ہے، دراصل بے لوث وہی ہو سکتا ہے جو ست چِت آنند ہو۔ جسے سچی بے غرضانہ محبت کرنا آتی ہو۔ جو خود پرماتما کی طرح ذرّے ذرّے سے محبت کرتا ہو۔ کرم یوگ کے راستے سے ہمیں پرماتما کے مقام تک پہنچنا ہے۔ حقیقی محبت ہی ہمیں بے لوث بناتی ہے۔ سچی محبت کا انحصار مادّی اور جسمانی ربط ضبط پر ہی نہیں ہوتا سچی محبت کرنے والے چاہے ایک دوسرے سے ہزاروں میل دُور ہوں پھر بھی اُن کا جذبہ محبت برابر قائم رہتا ہے۔ اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ایسی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا ردّعمل ہوتا ہے جو درد اور اذیت کا باعث ہو۔

اگر ہم اپنے بچوں کو کوئی چیز دیتے ہیں تو کیا ہم اُن سے اس کا معاوضہ طلب کرتے ہیں؟۔ ہرگز نہیں۔ ہم یہی سمجھتے ہیں نا کہ ان کی خاطر کام کرنا اپنا فرض ہے۔ اور یہی رویہ ہم کو دوسروں کے کاموں میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔ اگر ہماری زندگی کا اُصول اور عمل بلا معاوضہ کام

کرنے کا ہو جائے تو پھر دُنیا میں کوئی بھی کام ہم کو کسی بھی بندھن میں نہیں ڈال سکے گا۔ غلاموں کی طرح کام کرنے سے خودغرضی اور وابستگی پیدا ہوتی ہے آزادانہ کام کرنے کا نتیجہ آنند کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ دُنیا میں جن چیزوں سے آدمی کے کردار اور شعار کی تکمیل ہوتی ہے وہ ہیں طاقت اور رحم نیک بننے کے لئے ہمیں رحم دِل بننا پڑتا ہے۔ دراصل رحم ہی کو حق وانصاف کی بنیاد بنانا چاہئے۔

بے غرضانہ کارِ خیر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر کام کو خدا کی پرستش سمجھ انجام دیں۔ ہمارا معبود ہر وقت بے لوث کام میں مصروف ہے۔ اُسی کے نقش قدم پر چلئے۔ جس طرح پانی کنول کے پتے کو بھگو نہیں سکتا اسی طرح بے لوث کرم پھل کی خواہش کے بندھن میں نہیں ڈال سکتا۔ بھلا جس شخص نے اپنی خودی ہی کو مٹا ڈالا ہو اور جو کسی بات سے ملوث ہی نہیں ہوتا، اُس کو ثواب و گناہ سے کیا واسطہ، وہ جنگل میں رہے تو آزاد ہے اور شہر کی عصیاں آلود فضا میں رہے تو پاک وصاف ہے۔

مرتے دم تک بغیر حیل وحجت کے اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت اور مدد کے لئے وقف کر دینا ہی کرم یوگ ہے۔ ہمارا دھرم۔ ایمان مذہب تو

بس سیوا، خدمت ہونا چاہئے اور اس طرح دھرم کے تھوڑے کام سے
بھی بڑے بڑے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔



بھگتی یوگ

عشق الٰہی یعنی بھگتی یوگ کے معنی ہیں پرماتما کی سچی اور پُر خلوص تلاش یہ تلاش پریم یا محبت سے شروع ہوتی ہے۔ پریم ہی سے جاری رہتی ہے اور پریم ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ پرماتما کی انتہائی بھگتی میں صرف ایک لمحے کے لئے بھی دیوانہ ہو جانے سے دوامی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کسی انسان کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو ساری کائنات اُس کی محبت میں بس جاتی ہے۔ وہ سب سے محبت برتنے لگتا ہے۔ کسی سے نفرت نہیں کرتا اور اُس کو ہمیشہ کے لئے اطمینان قلب اور آسودگی کی نعمت عظمیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ محبت قطعاً بے لوث ہوتی ہے۔ اُسے دُنیوی مفاد حاصل کرنے ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ جب تک دِل میں ایک بھی خواہش باقی رہتی ہے عشق الٰہی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ بھگتی یوگ کا پایہ باقی سب یوگوں (کرم یوگ، راج یوگ، گیان

یوگ) سے بڑا ہے کیونکہ اِن یوگوں میں ایک مقصد (نجات) مدنظر ہوتا ہے لیکن بھگتی اپنا ثمرہ خود ہوتی ہے۔ یہ خود ہی وسیلہ اور خود ہی مقصد ہے۔ بھگتی کی منسلک کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ محبوب حقیقی کو پانے کے لئے اس سے زیادہ آسان اور کوئی طریقہ نہیں۔

بھگتی دو قسم کی ہے: ۱۔ گنی بھگتی ۲۔ پرا بھگتی

گنی بھگتی میں بھگوان کا بھگت اور بھگوان کو صرف اپنے لئے محدود اور مخصوص کرنا چاہتا ہے یا سب کو اپنے مخصوص معبود کی عبادت پر مجبور کرنا چاہتا ہے اور اس طرح اُس کی بھگتی خود غرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور یہیں سے تعصب اور دیوانہ پن کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن جب بھگتی میں پختہ کاری آجاتی ہے تو اُسے پرا بھگتی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس میں تعصب اور دیوانگی کے اظہار کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ گویا جس شخص پر پرا بھگتی کا نملیہ ہوتا ہے وہ خدائے محبت کے اس قدر قریب پہنچ جاتا ہے کہ پھر اُس کی ذات سے نفرت کے اظہار کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

جب بھگتی پرستش کی صورتوں میں نمایاں ہوتی ہے اِس کی حیثیت واقعی ایک وسیلے کی ہوتی ہے جس کی مدد سے انسان روحانی ارتقا

کی منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن آگے چل کر جب معبود کی حقیقت کا احساس ہونے لگتا ہے تو پرستش بھی اپنی ظاہری بندشوں سے آزاد ہونے لگتی ہے۔ جوں جوں انسان خدا کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے اُس کی پرستش بھی بلند صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور آخر کار معبود اور عبادت دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ جب بھگتی کا جذبہ پورے عروج پر پہنچ جاتا ہے تو سچا گیان یا حقیقی علم خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور بھگت بھگوان کے اشتیاق انگیز اور مسلسل یاد کو دِل سے لگائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس خود سپردگی، اس دھیان اور لگن ہی کو بھگتی کہتے ہیں۔ جب پرماتما کو اس طرح ہر وقت اور مسلسل یاد رکھنے کی مہارت ہو جاتی ہے تو ہر قسم کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ مسلسل یاد براہ راست دیدار سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلسل یاد کا عمل ہی بڑھتے بڑھتے اُس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں یہ دیدار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پرستش سے مراد ہی ہے مسلسل یاد۔ جس چیز کو ہم علم کہتے ہیں وہ کسی چیز کی مسلسل یاد ہی تو ہے۔

جب بھگوان کی یاد کو براہ راست مشاہدے کا بلند درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ موکھش کا سادھن یعنی نجات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ جو

چیز بہت زیادہ محبوب ہوتی ہے اُس کی تمنا بھی کی جاتی ہے۔ آتما بھی اپنے محبوب کی متمنی ہے۔ جس کو آتما سے انتہائی عشق ہوتا ہے، آتما بھی اُس کو اپنا محبوب بنا لیتی ہے اور پھر اپنے اِس محبوب کو اپنے تک لے آتی ہے۔ بھگت کو بھگوان کے پانے میں بھگوان خود مدد کرتا ہے۔ بھگوان نے فرمایا ہے ''جو ہمیشہ مجھ سے لو لگائے رکھتے ہیں اور پریم کے ساتھ میری یاد کرتے ہیں، مجھے بڑی بھگتی سے پوجتے ہیں۔ میں اُن کی قوت ارادی کو وہ راستہ دِکھاتا ہوں جس کے ذریعہ اُن کی رسائی مجھ تک ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو شخص بھگوان کے دھیان یعنی مسلسل یاد کو عزیز رکھتا ہے، جو براہِ راست مشاہدے کی ہی ایک شکل ہے، وہ بھگوان کو ضرور پالیتا ہے کیونکہ یہ دھیان خود اُس ہستی کو عزیز ہے جو دائم یاد ہماری آرزو اور ضرور پالیتا ہے کیونکہ یہ دھیان خود اُس ہستی کو عزیز ہے جو دائم یاد ہماری آرزو اور جس کا دیدار ہمارا مقصد حیات ہے۔ ایسا شخص پرماتما کو بھی محبوب ہے ایسے بھگت کی بھگوان کو بھی تلاش ہے۔

گویا بھگتی بھگوان کے ساتھ انتہائی پریم کو کہتے ہیں جس کا آغاز ہوتا ہے معمولی پوجا پاٹھ سے اور خاتمہ خدا کی بلند ترین درجے کی محبت پر۔

بھگتی یوگ کا مرکزی راز اس بات کے جاننے میں مضمر ہے کہ انسان کے دِل میں جو مختلف قسم کے احساسات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بذات خود غلط نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اِن کو نہایت احتیاط کے ساتھ زیر قابو لایا جائے اور اُن کو رہنمائی کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ بلند سطح پر پہنچایا جائے تا کہ انہیں بلند ترین مقام حاصل ہو جائے۔ جہاں پہنچ کر اِن تمام احساسات اور جذبات کا رُخ خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ رحمانی خصلت انسان وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ جسم صرف زندگی کے مقصد یعنی معرفت اور وصل الٰہی کے حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس کی مدد سے رُوح کی تربیت ہوتی ہے۔

بھگتی کی مختلف صورتیں

بھگتی کی پہلی صورت ہے ''شانت سبھاؤ'' یعنی پُر سکون طبیعت۔ اس سکون کے مقام پر عشق میں اضطراب نہیں ہوتا۔ دِل میں محبت کی آگ نہیں بھڑکتی۔ دِماغ میں عشق دیوانگی کی حد تک اثر انداز نہیں ہوتا۔ ایسا عاشق (بھگت) چپ چاپ خدا کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ شانت بھاؤ بھگت سکون پسند اور نرم دِل ہوتا ہے۔

پُر سکون بھگتی میں جب جذبات کی لہریں اُٹھتی ہیں تو وہ عام

سطح سے اُوپر اُٹھنے لگتی ہے۔ جب یہ جذبات خدمت گذاری کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ہم ایسی بھگتی کو داسیہ بھگتی کہتے ہیں۔ بھگتی کا یہ بھاؤ اُس وقت پیدا ہوجاتا ہے جس انسان خود کو پرماتما کا خادم (داس) سمجھتا ہے۔ اپنے آقا کے ساتھ ایک وفادار ملازم کی حیثیت سے وابستگی ہی اُس کا آدرش یا نصب العین ہوتی ہے۔

جذبات کی لہریں جب اُوپر اُونچی اُٹھتی ہے تو "سکھیہ بھاؤ" یعنی جذبہ دوستی تک پہنچتی ہے۔ بھگت بھگوان سے کہنے لگتا ہے کہ تُو میرا محبوب ہے۔ دوست ہے۔ دوست کے سامنے دوست اپنا دِل کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اسی طرح بھگت بھگوان کو اپنا راز دان بنالیتا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس کا دوست یہ جنم مرن کا ساتھی اُس کی خامیوں پر نکتہ چینی نہیں کریگا بلکہ خامیوں کے باوجود اُس کی مدد کریگا۔ جیسے دوستوں کے درمیان برابری کا تصور ہی کارفرما رہتا ہے ویسے ہی بھگت اور بھگوان کے درمیان دوستی اور برابری کا جذبہ محبت مؤجزن ہوتا ہے۔ من وتو کا فاصلہ کم ہونے لگتا ہے اور خدا ہمارا دوست بن کر ہمارے زیادہ نزدیک آجاتا ہے۔

یہ دُنیا تو بس کھیل کا میدان ہے جہاں ہر وقت یزدانی کھیل

جاری ہے۔ہم اس کھیل میں شامل ہیں۔خدا بھی اور بندے بھی۔ہم یہ کھیل اُسی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔خدا ہمارے کھیل کا دوامی ساتھی ہے اُس کو تو کھیلنے میں کمال حاصل ہے۔

بھگتی کی ایک صورت ہے ''واتشلیہ بھاؤ''۔اُس تصور کے تحت بھگت پرماتما کو جگت پتا سمجھ کر اُس کی عبادت کرنے کے بجائے اولاد کی طرح پیار کرتا ہے۔عام طور پر ہمارے دِماغوں پر خدا کے متعلق اقتدار و اختیار کا تصور کچھ اِس طرح غالب ہوتا ہے کہ بندہ و خدا میں فاصلہ قائم رہتا ہے۔ سچی محبت میں اس فاصلے کو مِٹا دینا پڑتا ہے۔بھگوان کو اولاد کی طرح پیار کرنے سے یہ فاصلہ باقی نہیں رہتا۔بھگتی میں خوف اور وہشت کا عنصر ہونا ہی نہیں چاہیئے۔تعظیم اور اطاعت کے تصورات کردار کی بقا کے لئے ضروری ہوتے ہیں لیکن جب کردار میں مضبوطی آجاتی ہے تو اِن تصورات کی حدوں سے آگے نکلنا ضروری ہوتا ہے۔ خدا کی عظمت، طاقت اور شان کے رعب میں آکر اُسے دیوتاؤں کا دیوتا قرار دینا بھگت کی نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔پرماتما کے پریم کی طلب میں جو لوگ دیوانے ہوتے ہیں وہ تو اُس کا قرب چاہتے ہیں۔

بھگت بھگتی یا عشق الٰہی کے بلند ترین تصور کو ''مادھوریہ'' کہتے

ہیں۔ اس تصور میں بڑی مٹھاس ہوتی ہے۔ اُس دُنیا میں جذبہ محبت کا بلند ترین اظہار مرد اور عورت کے پیار کی شکل میں ہوتا۔ اس عالم میں اس سے زیادہ واضح اور مضبوط تعلق کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے اس کو خود اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ یہ وہ پیار ہے جو زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کرتا ہے۔ اس جذبہ کے تحت بھگت خود کو بیوی سمجھ کر بھگوان کو اپنا خاوند تصور کرتا ہے اور اس کے قدموں پر اپنا سارا نچھاور کر دیتا ہے۔ بھگتی کے اس تصور میں ہم سب کے سب عورتیں ہیں۔ مرد ہے تو صرف ایک پرماتما۔

ہمارا محبوب ہے تو بس وہی خدائے مطلق۔ خلاصہ یہ کہ بھگتی کے اس تصور میں، اس رنگ میں مرد اور عورت کے کمال کو بھگوان کے لئے ارپن کر دینا پڑتا ہے۔ جو والہانہ محبت ایک مرد کو اپنی محبوبہ سے ہو سکتی ہے، یا جتنا پیار ایک عورت اپنے مالک کو دے سکتی ہے وہ ایک بھگوان پر لُٹا دیتا ہے۔

ہماری دُنیوی زندگی کے ناٹک میں محبت مختلف صورتوں میں نمودار ہوتی ہے۔ لیکن دراصل ایک ہی محبوب مطلق یعنی پرماتما کی طرف مرکوز ہوتی ہے۔ خدا ہی ہر صورت میں محبت کا مقصد ہے۔ خواہ

محبت ماں کی ہو۔ وہ پیار بہن کا ہو یا جاں نثار بیوی کا۔ محبت کی یہ دولت ہمیں اُس بلند و برتر ہستی کی نذر کر دینا چاہیئے جو نہ کبھی مرتی ہے اور نہ جس میں کوئی تغیر آتا ہے۔ اُس کا رُخ لازمی طور پر اُس ہستی کی طرف ہونا چاہیئے جو خود پیار کا ایک بے پایاں اور اتھاہ سمندر ہے۔ جس میں عشق محبت کے سب دریا آ کر مل جاتے ہیں۔



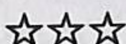
پرم آنند

علم کے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک کتابی علم کا درجہ دوسرا معرفت ذات کا درجہ۔ پہلا درجہ اپنی جگہ پر نہایت بلند مرتبہ ہونے پر بھی علم معرفت سے کم مانا گیا ہے۔ اس میں مقدس مذہبی کتابوں اور دینی رسم ورواج دونوں کا علم شامل ہے۔ معرفت کا درجہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ معرفت خود آگہی اور حقیقت شناسی پر مشتمل ہے۔

محبت کی انتہائی منزل کیا ہے؟ محبت کا کمال کیا ہے؟ یہ کہ جب انسان خدا سے محبت۔ محبت کی خاطر کرتا ہے۔ جب وہ اپنے محبوب حقیقی سے محض اس لئے محبت کرتا ہے کہ محبت کرنا ہی اس کی فطرت میں داخل ہوگیا ہے۔ جب خدا سے کچھ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب بھگوان سے پریم اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے بغیر دِل کو چین اور آرام ہی نہیں ملتا تو انسان کو یقیناً محبت کی معراج، محبت کی انتہائی منزل حاصل ہو جاتی ہے۔

جب پریم یا محبت کا یہ بلند ترین مقام حاصل ہوجاتا ہے تو انسان کو مذہبی اور فلسفی نظریوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تمام فلسفہ اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ جب فلسفے کا سرچشمہ ہی مل جائے تو فلسفے کی پرواکون کرتا ہے۔ آزادی۔ مکتی اور نجات کا خیال بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ بھگوت پریم کے آنند اور سرور میں مکتی (نجات) کی پروا کسے ہوتی ہے۔ جب انسان کا دِل اسے قسم کے محبت سے لبریز ہوجاتا ہے۔ تو اس کو سرور کامل (پرم آنند) کی دوامی نعمت ہاتھ آتی ہے۔ بھگوت بھگتی یا پریم کی اس مقدس اور مبارک دیوانگی سے دُنیاوی خواہشات کا مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دُور ہوجاتا ہے۔ اور جب خواہشات مِٹ جاتی ہے تو خودغرضی بھی رُخصت ہوجاتی ہے۔ عاشق کو خدا کی قربت حاصل ہوجاتی ہے اور جب دِل میں خدا بسنے لگتا ہے تو پھر اُس میں کسی دوسرے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ انسان کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ وہ دُنیا کے تمام رِشتوں کو خدا ہی سے منسوب کرنے لگتا ہے۔ باپ ماں، دوست، آقا اور عاشق غرض ہر دُنیوی تعلق کو خدا پر عائد کرتا ہے۔ وہ خدا کو باپ کہہ کر اُس کی عزت کرتا ہے۔ ماں پکار کر اُس کا سہارا تلاش کرتا ہے، بیٹے کا پیار دیکر اُس کو اور بھی اپنے

قریب لے آتا ہے۔ مالک سمجھ کر اُس کی خدمت کرتا ہے یا عاشق مان کر اُس سے محبت کی دَولت مانگتا ہے۔ وہ خدا کو اُن سب صورتوں میں دیکھتا ہے اور آخر کار اس کی محبت اِن تمام مقاماتِ راہ سے گذر کر عروج کے اُس مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں اُس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معبود کی ہستی میں محو ہو گیا ہے۔ محبت کی ابتدائی صورت خود غرضی ہے لیکن آہستہ آہستہ ہماری محبت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار ایک دِن ایسا آتا ہے جب تمام کائنات ہماری محبت میں بس جاتی ہے اور ہر طرف خدا کی لامحدود اور واحد ذات کا نور پھیل جاتا ہے۔



محبت

حصول روحانیت کے لئے کوئی مخصوص یوگ (طریقہ عمل) لازمی نہیں۔ کوئی بھی طریقہ یا آدرش جو موزوں سمجھا جائے اپنایا جا سکتا ہے۔ ہر شخص کا میلان طبع اُس کی فطرت اور اُس کی جبلت کے مطابق جداگانہ ہوتا ہے اور اُسی میلان طبع کے مطابق وہ اپنا نصب العین یا آدرش بناتا ہے اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک خاص راستہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ راستے کئی ہیں لیکن سب کی منزل مقصود ایک ہی ہے۔

Cows are diffrent in colour but Milk is the Same

راستے کی علیحدگی کو ہم سب کے ہمسفر ہونے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم میں ہمہ گیری ہونی چاہئے۔ ہماری سیرت اور ہمارا کردار ایسا ہونا چاہئے کہ ہم ہر قسم کے نظریہ کو سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔ آپ

کو یہ کہنے کا پورا حق ہے کہ آپ اپنے مذہب کو سچا بتائیں لیکن آپ کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ آپ دوسروں کے مذہب کو جھوٹا کہیں۔ ہر مذہب کا ایک خاص پیغام ہے جو وہ دُنیا کو پہنچانا چاہتا ہے۔

خدا نے تین خاص چیزیں انسان کو عطا کی ہے۔ ایک تو ہے یہ جسم انسانی۔ دوسری آزادی یا نجات کی تمنا۔ اور تیسری ایسے انسان سے امداد حاصل کرنے کی طاقت جو آزاد ہو چکا ہے۔ ہمیں اِن تینوں سے کام لینا چاہیئے۔ جسم کو صحت مند بنا کر بھگوان کی سیوا میں لگانا ہے۔ آزادی کی خواہش کو اُبھار کر عشق کی دیوانگی کے درجے تک پہنچانا اور کسی سچے سالک کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر منزل عشق تک پہنچنا ہے۔ یاد رکھیئے بھگتی یا حُبّ الٰہی شخصی خدا کے بغیر ممکن نہیں۔ عاشق اور معشوق کا نام ہی تو عشق محبت ہے۔ اسی لئے بھگت اپنے بھگوان کو انسان کا روپ دیکر اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ خدا لامحدود ہے لیکن محبت اُس کی لامحدودیت کو محدود انسانی قالب میں بھی قائم رکھ کر اُس کی پوجا کرتی ہے۔ جب تک ہم جسم کے قید میں ہیں ہمارے لئے لامحدودیت کا تصور ممکن ہی نہیں۔ ہم بقسد حواس خدا کا تصور شخصی صورت میں ہی کر سکتے ہیں اور دوسرا اس تصور کا انحصار خود اپنی اپنی نظر پر ہوتا ہے۔ خدا کے تصور کی تین

اِرتقائی منزلیں ہوتی۔ابتدائی تصور وہ ہے جس میں خدا ہم کو خود ہماری طرح مجسم نظر آتا ہے۔

اس طرح کے تصور کی مثال آپ کو آرٹ میں ملتی ہے۔دوسرا تصور اس سے زیادہ بلند ہے ہم خدا کو انسانی صفت سے متصف کرتے ہیں اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے ہمارے سامنے وہ بلند ترین آخری تصور آجاتا ہے جس میں ہم براہِ راست خدا کو خدا کی حیثیت سے دیکھ پاتے ہیں۔لیکن یاد رکھئے کہ کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو اِن تینوں منزلوں میں ہم واحد خدا ہی کو دیکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی ہستی ہے ہی نہیں۔اپنی سرشت سے مجبور ہو کر ہم اسے خود اپنی ہی شکل میں دیکھ سکتے ہیں البتہ انسان کی صورت میں بھی اُس کا تصور کرتے ہوئے اُس نے لا ابتدا اور لا انتہا غیر محدود اور بے پایاں کہتے ہیں۔

ہر مہب میں ایشور بھگتی (حب الٰہی) دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔پہلی صورت میں مختلف قسم کے خارجی دستوروں رسموں اور رواجوں تک محدود ہوتی ہے اس میں مخصوص دُعاؤں اور منتروں وغیرہ کی شکل میں الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں بھگتی پریم یا محبت بن کر نکلتی ہے۔یہ وہ صورت ہے جہاں محبت اپنی منزل آپ بن

جاتی ہے۔ بھگت ہر قسم کی خارجی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔
مکمل آزادی یا نجاب حاصل کرنے کے لئے قانون کی حدوں سے گذرنا ضروری ہے۔ خارجی امداد کے مختلف طریقے، یہ تمام دستور اور رسمیں، یہ طرح طرح کے اُصول اور نظریئے سب کا اپنا اپنا جداگانہ مقام ہے۔ سب کا مقصد یہ ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے پہلے ہمیں سہارا دیں۔ اپنی بے پایاں قوت کا احساس ہونے تک ہماری پشت پناہ بنیں۔ جب ہم میں توانائی آجائیگی تو اِن چیزوں کی چنداں ضرورت نہ رہیگی۔ یہ چیزیں تو ہماری دایہ ہیں۔ ابتدائے عمر میں اِن کے بغیر ہمارا کام چل ہی نہیں سکتا یہ جو مقدس مذہبی کتابیں ہیں ان کی حیثیت بھی بس دایہ کی سی ہے۔ یہ ہماری روحانی تربیت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔
جسم اور دِماغ (من اور شریر) دراصل ایک ہی چیز کی دو غیر مرئی صورتیں ہیں۔ ہمارے من کی ساخت لطیف اجزاء سے ہوتی ہے اور جسم کشف عناصر سے بنتا ہے لطافت کشافت سے ہمیشہ بالا ہوتی ہے۔ اس لئے جب انسان اپنے من کو قابو میں کر لیتا ہے تو اُس کا جسم خود بخود زیرِ عمل آجاتا ہے۔ یہی حال خیال اور بیان کا بھی ہے۔ ہر خیال

اپنے اظہار کے لئے الفاظ ایجاد کرلیتا ہے۔ الفاظ محض خیال کی مجازی صورت ہے۔ لا محدود تصور الفاظ میں مجسم ہوتا ہے۔ جیسے جسم کی وساطت سے ہم اپنے غیر مادی اپنے پن کو سمجھ پاتے ہیں اسی طرح شبد کی وساطت سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہر لفظ ایک خاص مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ ہر مذہب میں مخصوص الفاظ محبت۔ امن وسکون مسرت، صداقت، پاکیزگی کے جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے ہوتے ہیں۔ یہ مخصوص الفاظ (شبد) روحانی ترقی میں ہماری مدد کرے ہیں۔ ہر لفظ ایک مخصوص نصب العین کا ایک خاص آدرش کا آئینہ دار ہوتا ہے اوراس کی وساطت سے یعنی اس پر یکسوئی سے غور کرکے ہم اس آدرش کے نزدیک پہنچ سکتے ہیں۔

سچی بھگتی کا عملی پہلو یہ ہے کہ دوسرے کے عیوب پر نظر نہ ڈالی جائے انسان کے چند نقائص کو دیکھ کر اُس کے پورے کردار کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا نکتہ چینی تو ایک عملی تخریب ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہمیشہ اپنی اور دوسروں کی توجہ بلند اور اعلیٰ چیزوں کی جانب رکھیں۔ ہم سب کی اصل پاک اور نورانی ہے۔ روح کی شان اور عظمت سب میں یکساں ہے۔ فطری بلندی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

بھگتی کی عملی صورت کا دوسرا پہلو ہے کہ ظاہری رسم و رواج کی قیود سے نکل کر پرستش کو اس محبت کی درجے تک پہنچا دینا جو ہر بندش سے آزاد ہو۔ انگریزی زبان کا یہ ایک قول بہت مشہور ہے کہ ''گرجا میں پیدا ہونا تو بہت اچھا ہے، لیکن گرجا میں مرنا اچھا نہیں''۔ مطلب یہ کہ مذہبی رسم و رواج کی چار دیواری میں نشو و نما پانا تو روحانی اِرتقا کے لئے ضروری ہے لیکن محض انہیں بندشوں میں مقید رہ کر زندگی گذارنا اور رُوحانیت کی علامت نہیں۔ ایک نازک پودے کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے گرد جھاڑیاں لگا دی جائیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد اِن جھاڑیوں کا ہٹا دینا لازمی ہو جاتا ہے ورنہ پودا بڑھ کر درخت نہیں بن سکتا۔ یہی حال پوجا پاٹھ یا عبادت کا ہے۔ یہ تمام رسم و رواج اور یہ عبادت کے طریقے اپنی ایک حد تک ضروری ہیں لیکن درجہ بدرجہ اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے ہم اس حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جب ایشور بھگتی یا عشق الٰہی میں کمال ہو جاتا ہے تو پھر ہم ایشور کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔

عشق الٰہی (ایشور پریم) کی بھی دُنیاوی محبت کی طرح پانچ صورتیں ہیں۔ ایک محبت وہ ہے جس میں محبوب کی عظمت اور طاقت کا

خیال حاوی رہتا ہے اور ساتھ ہی محبوب سے مُرادیں پوری ہونے کی توقع بھی ہوتی ہے۔ اِس محبت کا درجہ سب سے کم ہے۔ اسکی مثال وہ محبت ہے جو ایک بچے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔ محبت جب مُرادوں کی حد سے گذر کر صلہ اور انعام کے خیال کو ترک کر دیتی ہے۔ تو خدمت کے مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ محبت کی دوسری صورت ہے۔ انسان خدا کو اپنا آقا، اپنا مالک سمجھ کر اُس کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اُس خدمت کو اپنا انعام سمجھتا ہے۔ خدمت کی یہ خواہش اور ہر قسم کے جذبات پر غالب آجاتی ہے یہاں تک کہ ہمیں اِس بات کا خیال تک نہیں رہتا کہ ہمارے مالک کی صفات کیا ہیں۔ وہ اچھا ہے مہربان ہے یا نامہربان۔ ہمارے لئے اس کی خدمت کا موقع ملنا ہی غنیمت ہے، عین مسرت ہے۔ وفادار خادم کو جب مالک کا تقرب حاصل ہونے لگتا ہے تو محبت بلند ہو کر دوستی کے درجہ تک جا پہنچتی ہے۔ یہ ہے عشق کی تیسری صورت۔ حقیقی دوست وہی ہے جن میں کمتری یا برتری کا احساس کلیتاً مٹ گیا ہو، جو ہر حیثیت سے مساوی ہو۔ اِس کی مثال کھیل کود کے ساتھی ہیں جو ہر حالت میں ایک دوسرے کے لئے رفاقت کا دم بھرتے ہیں۔ انسان اور خدا کا تعلق جب محبت کے اس درجے تک پہنچ جاتا ہے

توانسان خدا کو اپنا دوست اور رفیق سمجھنے لگتا ہے۔

اس سے بھی بلند درجہ ماں کی محبت کا ہے۔ ماں کی بے لاگ محبت اپنی مثال آپ ہے، جب بھگتوں کی محبت یہ چوتھی صورت اختیار کرتی ہے تو وہ بھگوان کو اپنا نونہال سمجھ کر اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ محبت، کی یہ صورت دوسری صورتوں کے مقابلے زیادہ بلند سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں خوف کا عنصر ذرا بھی نہیں ہوتا۔

پانچواں یعنی سب سے بلند پایہ محبت خاوند اور بیوی کی محبت ہوتی ہے۔ اس مقام پر آ کر محبت اپنا انعام ہو جاتی ہے۔ یہ محبت کلیتاً بے غرض ہوتی ہے۔ ایشور بھگتی جب اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو یہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ خدا کو محبوب کامل جان کر عاشقانِ حقیقت اس پر دِل و جان قربان کر لیتے ہیں۔ اس میں اِن کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ عشق مجازی کی زبان میں اس خیال کو اس حسین انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

چار آنکھیں ملتی ہے تو دو رُوحوں میں انقلاب آنے لگتا ہے۔
محبت اِن دونوں رُوحوں کے درمیان آ جاتی ہے اور ایک دوسرے سے
ملا کر یکجان دو قالب بنا دیتی ہے۔

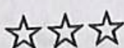
دو رُوحیں باہم واصل ہو کر ایک ہو جاتی ہے۔ حسن و محبت کے

اس کمال کو ہم خدا کہتے ہیں۔ یہی ہم سب کا محبوب ہے۔ انسان دراصل اِسی آدرش سے محبت کرتا ہے، اسی محبت کا متلاشی ہے۔ محبت ایک مثلث کی مانند ہے۔ اِس کا پہلا زاویہ یہ ہے کہ اس میں کسی سے کچھ مانگا نہیں جاتا ہے اس میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا۔ اس کا دوسرا زاویہ یہ ہے کہ یہی زاویہ اس مثلث کی راس بھی ہے۔ محبت محض محبت کی غرض سے کی جاتی ہے۔ محبت ہی کی طاقت سے حواس میں لطافت اور بلندی آتی ہے۔ جب انسان خدا کو اپنی زندگی کا بلند ترین مقصد نصب العین یا آدرش سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے، جب وہ اُس کے سامنے بھکاری بن کر نہیں جاتا، اُس سے کچھ طلب نہیں کرتا تو اُس کی محبت اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچ جاتی ہے اور اس عالم کائنات کی ایک بڑی قوت بن جاتی ہے۔

اس لئے آغاز کر کے دیکھئے، انجام کار منزل مقصود تک رسائی ہو ہی جائے گی ضرورت تو اِس بات کی ہے کہ اپنی فطرت اور جبلت کے مطابق ہم خدا سے محبت کرنا شروع کر دیں اور باقی سب کچھ اُسی پر چھوڑ دیں۔

دُنیا کو ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جنہیں دیوانگی کی حد تک

خدا سے محبت ہو۔ ایسے ہی انسان دُنیا کا حقیقی معنوں میں بھلا کر سکتے ہیں۔ ایشور بھگتی خود اعتمادی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی اسلئے اپنے اندر اعتماد کا جوہر پیدا کیجئے۔ سب سے پہلے اپنے کردار کو مضبوط بنائیے اور اس کے لئے تین باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک احساس اور درد آشنا دِل، جس میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ دوسرا تیز وطرار دِماغ جس میں فکر کی گہرائی اور خیال کی وسعت ہو اور تیسرا مضبوط اور توانا ہاتھ جن میں قوت عملی ہر وقت بے تاب اور بے قرار رہتی ہو۔ اپنے دِل میں دُنیا کے لئے درد پیدا کیجئے، محبت اور اخوت میں بغض اور حسد کی گنجائش نہیں۔ جس شخص میں بغض وحسد ہوگا وہ کبھی محبت کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ بغض وحسد تو نہایت ہی خوف ناک گناہ ہے۔ آپ محبت ہی کو اپنی زندگی کا محرک بنائیے۔ محبت کبھی ناکام ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اگر آپ کے دِل میں محبت ہے تو آپ کا دِماغ خود بخود غور وفکر کے صحیح راستے پر چل نکلے گا۔ آپ کے ہاتھوں سے نیک اعمال خود بخود سرانجام پانے لگیں گے۔ اس لئے انسان کی پہلی اور آخری منزل ہے محبت اور بس محبت۔



دیوی پوجا

دیوی پوجا سے مُرادزندگی کے جنسی پہلوکونمایاکرنانہیں۔یعنی یہ کہ ماں اور باپ کے درمیان کسی قسم کا امتیاز قائم کیا جائے۔لیکن اس تصور کی تہہ میں جو خیال کام کر رہا ہے وہ ہے انرجی Energy یعنی طاقت کا خیال۔اُس طاقت کا خیال جو سب جانداروں کے اندر کام کررہا ہے۔اس تصور کی اِرتقا آہستہ آہستہ ہوئی۔جیسے ایک بچہ ہڈی ماس اوراعصاب (Nerves) کا محض ایک پتلا ہوتا ہے۔لیکن جوان ہوکر طاقت اورتوانائی کا مجسمہ بن جاتا ہے اُسی طرح خدا کے متعلق انسانی تصورات بھی آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے اورآخرکاراس نتیجے کے طورانرجی یا طاقت کا تصور رونما ہوا۔اس نئے اُصول کی غیر موجودگی میں زندگی کے تمام بنیادی سوال بدستوراپنی جگہ قائم رہتے ہیں اُن کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔لیکن خدا کا تصور جب Energy یعنی طاقت کی صورت میں کیا جاتا ہے تو یہ مشکل دُور ہونے لگتی ہے۔اس

اُصول کے مطابق اس تمام مظاہراتی دُنیا کے پس پشت صرف ایک ہی طاقت کام کررہی ہے یہ طاقت خواہ کسی صورت میں جلوہ گر ہو اس کی نوعیت یکساں رہتی ہے۔ خدا کا قدیم تصور شخصی تھا لیکن اس نئے خیال سے ایک عالم گیر طاقت کے تصور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تصور کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ خدا طاقت Energy ہے۔ شکتی ہے۔ اگر ہم اس شکتی طاقت یا انرجی کو خدا کے وُجود سے الگ کرتے ہیں تو خدا کی حقیقت ہی بدل جاتی ہے۔

ہندوستان میں شیطان کا تصور کبھی تھا ہی نہیں۔ اس لئے یہاں اس نئے تصور کا شعور پیدا ہوا کہ خیر وشر ایک ہی طاقت کی دو صورتیں ہیں۔ شر ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس عالم کائنات کا وجود ایک حقیقت ہے جس میں نیکی اور بدی دونوں شامل ہیں۔ اگر اس عالم کا کوئی خالق ہے تو نیکی اور بدی یہ دونوں چیزیں بھی اُسی کی تخلیق ہیں۔ اگر اس جہاں کا کوئی حکمراں ہے تو اس کی قدرت خیر وشر دونوں پر ہے۔ وہ دونوں کے لئے ذِمّہ دار ہے۔ اگر اُس کی طاقت سے ہم کو زندگی نصیب ہوتی ہے تو اُسی کی طاقت ہماری قوت کا باعث بھی ہے۔ ہماری خوشی ہمارے غم دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

اسی کی بدولت ہمارے قہقہوں اور آنسوؤں میں باہم دیگر ایک ربط ہے۔ اس طرح اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو وہ پھر خیر و شر دونوں کا خدا ہے۔ اگر مجھے خدا سے عشق ہے تو مجھے ہر حالت میں اُس سے پیار کرنا ہوگا۔ ہر صورت میں اُسے اپنانا ہوگا۔ عارف اور عاصی دونوں میں اُس کا جلوہ یکساں طور دیکھنا ہوگا۔ چراغ سے ہر حالت میں روشنی برستی ہے۔ روشنی بذات خود اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ ہم خود اِس کو اچھے یا برے کام کے استعمال میں لاکر اچھی یا بری بنا دیتے ہیں۔

خدا کی طاقت یا انرجی کے اس نظریئے کا کچھ نام رکھا جانا ضروری تھا تا کہ اس کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آسکے۔ اسی لئے اس طاقت یا انرجی کو "ماتا" کا نام دیا گیا ہے جسے ہم "شکتی" بھی کہتے ہیں۔

ہندوستان میں عورت کو جو سب سے بلند مرتبہ دیا جاتا ہے ماں کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔ ماتا کا پایہ بیوی سے بھی بلند ہوتا ہے۔ بیوی اور بچے انسان کو چھوڑ کر چلے جاسکتے ہیں لیکن ماں کبھی ایسا نہیں کرتی۔ ماں ہمیشہ ماں رہتی ہے۔ اس کی محبت کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ وقت کے ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ماں کی پاک محبت مین کسی قسم کی غرض نہیں ہوتی۔ وہ کوئی معاوضہ یا عوض طلب کرنا نہیں

چاہتی۔ اس کی محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ ایسی محبت کون کر سکتا ہے۔ کس کے پہلو میں ایسا بے غرض دِل ہو سکتا ہے۔ اولاد کی محبت ہو یا بیوی کی کسی کا مقابلہ ماں کی محبت سے نہیں ہو سکتا۔ ماں کی محبت تو بے بدل ہوتی ہے۔ اسی لئے کائناتی طاقت کو ماتا کا نام دیا گیا ہے۔ ماتا ہی وہ شکتی ہے جس کا جلوہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی ذات سے یہ عالم کائنات پیدا ہوتا ہے۔ اسی کی ذات سے یہ فنا بھی ہوتا ہے اور تخلیق و تخریب کا یہ سلسلہ کچھ اِس طرح جاری رہتا ہے۔ کہ تباہی اور فنا ہی تخلیق اور آفرینش کا لفظ آغاز بنتی ہے۔ ماں کی محبت کو لفظوں میں بیان کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ اس کو صرف سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی طرح ہمیں جگت ماتا کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ماں کی بے لوث محبت کا تقاضا ہے کہ ہم ماں کے چرنوں میں اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہیں۔ راحت کا طلبگار کون نہیں ہوتا، لیکن اگر کبھی رنج بھی پیش آئے تو ہمیں اُس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ بہادری اور دلیری اسی میں ہے کہ آدمی نڈر ہو کر ماں کی ذات میں پورا اعتقاد رکھے۔ اُس کے اس اعتقاد میں کسی وجہ سے بھی فرق نہ آنے پائے۔

یہ زندگی اور موت دونوں ماتا ہی کے سائے تو ہیں۔ سُکھ اور

دُکھ اس کے وجود سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام قسم کی راحتیں اُس کی ذات کا جلوہ ہے۔ زندگی بھی ماتا ہے اور موت بھی ماتا۔ جنت بھی وہی اور دوزخ بھی وہی۔ اُس کی حقیقت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کی ہستی میں محو ہو جائے۔ ڈوب جائے۔ اگر ہم ماتا کو نہیں پہچان پاتے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں خود میں یقین و اعتماد نہیں۔ ہم صبر و تحمل سے کام نہیں لیتے۔ ہم دلیری اور ہمت سے کوسوں دُور ہیں۔ ہم خدا کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔ جب تک ہم ساری کائنات کو یکساں نظر سے دیکھ کر اُس کے ساتھ محبت نہیں کریں گے۔ جب تک ہماری محبت کا یہ جذبہ بے غرضانہ اور غیر فانی نہ ہوگا ہم بار بار گمراہی کا شکار ہوتے رہیں گے۔ لیکن بے غرضانہ محبت کی اس منزل پر پہنچنے سے ہر چیز کی جزوی اور انفرادی ہستی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گی۔ اور ہم کو ہر چیز میں صرف اُسی کا لامحدود اور لافانی جلوہ نظر آنے لگے گا۔



راج یوگ

دُنیا کی دوسری سائنسوں کی طرح راج یوگ بھی ایک معتبر سائنس ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری سائنس مادی مشاہدات پر مبنی ہے اور راج یوگ شعوری عالم کے واقعات کی تشریح اور تربیت کرتا ہے۔ یہ علم زندگی کی بنیادی سائنس ہے اور رُوحانی عالم تک جانے کا راستہ دِکھاتا ہے۔ اس کی بنیاد عقل اور شعور پر ہے اور بحیثیت سائنس کے اس علم کا اکتساب دِماغی طاقت اور عقل کاوِشوں سے ہوتا ہے۔ یکسو دِماغ ہی تو تمام علم کا ماخذ ہے اور راج یوگ ہمیں یکسوئی دِماغ سکھاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آخرکار یہ عقل وشعور کی حدود سے پرے نکل جاتا ہے۔ یوگ کے لفظی معنی ہیں ''قابو پانا'' یا جوڑنا۔ یوگ روح انسان کو رُوح عظیم یعنی خدا سے واصل کرتا ہے۔ سائنس کی تمام کوشش اِسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف مرکوز ہیں کہ مادہ کو ہمارا غلام ہونا ہی چاہئے۔ یوگ ہمیں قدرت پر قابو پانے کا راستہ دِکھاتا ہے۔

یوگ دِماغ کے حدود سے گذر کر شعور کی وسعتوں میں جانے کا علم ہے۔ اسی علم کی بدولت ہم بالآخر اپنی حقیقت کو پاتے ہیں جو مافوق الشعور ہے۔ مسلسل اور مخلصانہ عمل سے لاعلمی اور جہالت کے پردے یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں اور ہمارے شعور کے نئے نئے رُخ آشکار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے تہہ بستہ دِماغ کی تہیں ایک ایک کرکے کھلتی جاتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی زندگی کے نئے واقعات اور نئی حقیقتوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ ہمارے سامنے نئے نئے عالم تخلیق ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نئی نئی قوتیں ہمارے ہاتھ آجاتی ہے۔

راج یوگ کے عمل میں اگر خطرہ ہے تو یہی ہے کہ اِن قوتوں کو حاصل کرکے انسان اسی مقام پر رُک جاتا ہے۔ ہمیں راہ میں رُکنا نہیں چاہئے۔ یہ قوتیں چمکتے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں کے برابر ہیں، اہل بصیرت کی آنکھوں میں ان سے کیا چکا چوند پیدا ہوگی؟ یوگ کے اس مقام سے آگے تو رُوحانیت کے لال و جواہر کی کان ہے۔ ہمیں تو مقامات راہ سے آگے نکلنا ہے۔ ہماری منزل تو خود خدا ہے۔ خدا ہی زندگی ہے اور خدا کو نہ پانا ہی ہماری موت ہے۔

راج یوگ کے عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔اوّل اِس دُنیا اور عقبیٰ میں عیش وطرب اور تکمیل لذات کے تمام خیالات کا ترک اور صرف خدا سے ہی دِل لگانا۔خدا ہی واحد حقیقت ہے۔ہم دُنیا میں معرفت حق کے لئے آئے ہیں۔قوتیں پانے کے لئے نہیں۔لذتیں حیوانوں کے لئے چھوڑ دو۔انسان کا وجود معنوی غور وفکر کے لئے بنا ہے اور اسے اُس وقت تک جدوجہد کرنا چاہئے جب تک کہ نہ وہ موت کو مسخر کر لے۔انسان کی نظر حق وصداقت کی روشنی دیکھنے کے لئے بنی ہے۔جسمانی احساسات کے اندھیرے سے نکلنا ہی ہمارا مقصد حیات ہے۔ہمیں اپنی سب کوششیں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مخصوص کر دینا چاہئے۔باقی سب فضول ہے۔جاہ مرتبہ بے معنی ہے۔سماج پارائے عامہ کی پرستش بت پرستی ہے۔لگن لگاؤ تو بس بھگوان سے۔آخر جسمانی لذات اور دُنیاوی خواہشات کی حقیقت ہی کیا ہے۔

ترک خواہشات بذات خود کافی نہیں۔یوگ کے عمل کے لئے دوسری ضروری بات ہے اپنے دِل میں معرفت حق اور معرفت رب کی بے پناہ آرزو پیدا کرنا۔خدا کو پانے کے لئے بے تاب اور بے قرار

ہو جاؤ۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی سانس لینے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ صرف بھگوان کی چاہت کرو۔ کسی دوسری چیز پر نہ جاؤ۔ باقی تو سب چھلاوہ ہے۔ ہر طرف سے منہ موڑ لو اور صرف خدا ہی کی تلاش کرو۔

تیسری ضروری چیز جو اس تلاش کی تکمیل کے لئے ضروری ہے ریاضت۔ ریاضتیں چھ ہیں۔

۱۔ ضبطِ دِماغ۔ من کو اِدھر اُدھر جانے سے روکنا۔

۲۔ ضبطِ حِس۔ حواس کو آوارہ بھٹکنے سے روکنا۔

۳۔ من (دِماغ) کو بطون کی جانب مائل کرنا۔

۴۔ بغیر شکوہ شکایت کے زندگی کے ہر واقعہ کو قبول کرنا۔

۵۔ دِماغ کو ایک ہی خیال پر مرکوز کرنا یہاں تک کہ وقت کا احساس بھی باقی نہ رہے۔

۶۔ اپنی اصلی فطرت یعنی اپنی رُوحانی حقیقت پر بار بار مسلسل غور کرنا۔

دوسرے الفاظ میں ریاضت کے معنی ہوئے کہ اپنے دِماغ اور حواس کو یکسو کر کے اپنی داخلی حقیقت پر مرکوز کرنا۔ جسمانی انفرادیت

کے وہم سے چھٹکارہ پاؤ۔ اپنی کمتری اور فرزِ مائیگی کے خیال کے طلسم کو توڑ دو۔ دِن رات ہر وقت ہر گھڑی اپنے آپ سے کہو اور سمجھو کہ تم کیا ہو۔ ہماری اصل کیا ہے۔ یہاں تک کہ تم محسوس کرلو کہ تم خدا سے واصل ہو گئے ہو۔ اِس ضبط و نظم کی پابندی کے بغیر نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ہمیں محسوسات کی حدوں سے پرے جانا ہے اور ادراک کی حدوں کی بھی عبور کرنا ہے اور ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ ہم میں ایسا کرنے کی طاقت ہے۔



راج یوگ کے لئے ضروری سبق

پہلا سبق:

اس سبق کا مقصد انسان کی انفرادیت، اس کے احساس خودی کو اُبھارنا ہے۔ انفرادیت کی نشوونما لازمی ہے۔ بالآخر سب مرکز حیات تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں یکسانیت اور وحدت ہی کا احساس ہوتا ہے لیکن وحدت الوجود کے اس مقام تک پہنچنے کے لئے انسان کی خودی کو تقویت دینا ضروری ہے۔

یہ بے بہا قوت ضبط اور اعتدال سے حاصل ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے والا یا فاقے کرنے والا یوگی نہیں ہوسکتا۔ اُسی طرح زیادہ سونے والا یا نیند نہ کرنے والا بھی یوگ حاصل نہیں کرسکتا۔ جسمانی سطح سے اوپر دِماغی سطح پر بھی ضبط کی ضرورت ہے۔

یوگی کے لئے تین ضروری چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ جسمانی اور ذہنی پاکیزگی

۲۔ صبر اور تحمل

۳۔ استقلال اور ثابت قدمی

یوگ کے طالب کو جسم اور ذہن کو پستی کی طرف لے جانے والی ہر ناپاکی اور گندگی سے دُور رہنا چاہئے۔ اور اُسے اپنے عمل پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے۔ یوگ کوئی آسان کام نہیں۔ ممکن ہے شروع شروع میں حیرت انگیز واقعات اور مظاہرے پیش آئیں لیکن یہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہتے۔ وہ زمانہ جب یوگ کرنے والے کو رُوحانی ترقی کو کوئی ظاہری ثبوت یا نشان نہیں ملتا بڑا مشکل زمانہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات مایوسی اور نا اُمیدی چھا جاتی ہے۔ لیکن عامل کو صبر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ انجام کار اُسے یقیناً اپنا مقصد حاصل ہوگا۔ ثابت قدمی اپنا انعام ضرور لاتی ہے۔ ہر حالت میں ریاضت جاری رہنی چاہئے۔ صحت ٹھیک ہو نہ ہو مشق اور ریاضت کا ناغہ ایک دِن بھی نہیں ہونا چاہئے۔

مشق یا ریاضت کا بہترین وقت وہ ہے جب رات اور دِن ملتے ہیں ہمارے جسموں کے مدوجزر میں یہ سب سے زیادہ پُرسکون وقت ہے۔ اِس وقت جسم میں پورا توازن ہوتا ہے۔ اگر مشق یا ریاضت

اِس وقت ممکن نہ ہوتو پھر صبح سویرے اور رات کو سوتے وقت کر لینی چاہئے۔ مشق یا ریاضت کے لئے ذاتی صفائی نہایت ضروری ہے۔ روزانہ غسل یا اشنان کرنا لازمی ہے۔

ریاضت کا طریقہ یہ ہے:

غسل کے بعد مشق کے لئے جم کر بیٹھئے اور دِل میں خیال کیجئے کہ آپ چٹان کی طرح اپنی جگہ مضبوط ہیں اور کوئی چیز آپ کو ہلا نہیں سکتی۔ سر بازوں اور کمر کو ایک سیدھ میں رکھئے خیال رہے کہ ریڑھ کی ہڈی پر کسی قسم کی رُکاوٹ نہ آئے۔ اس طرح اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد دِل میں خیال کیجئے کہ سر سے پاؤں تک آپ کے جسم کا ہر عضو کامل اور دُرست ہے۔ اس خیال کی شدت یہاں تک ہو کہ آپ کے جسمانی کمال کی تصویر آپ کے دِماغ پر چھا جائے اور پھر اِس خیال سے گذر کر تمام جسم کے مکمل ہونے کے خیال کو اپنائے۔ خیال کیجئے یہ جسم خدا کا عطا کیا ہوا ایک مکمل آلہ ہے جس کی مدد سے آپ کو حقیقت تک پہنچنا ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ جسم ایک جہاز ہے جس میں بیٹھ کر آپ کو سنسار کا سمندر پار کرنا ہے اور ابدی اور سرمدی حقیقت کے ساحل تک پہنچنا ہے۔

اب ناک کے دونوں نتھنوں سے ایک لمبا سا سانس لیجئے۔ پھر اُسے باہر پھینک کر اُس وقت تک دم سادھے رہئے جب تک آپ آسانی سے ایسا کرسکتے ہیں۔ اس طرح چار بار سانس لیجئے اور چھوڑیئے۔ اس کے بعد معمول کی طرح طبعی انداز ے سے سانس لینے لگئے اور خدا سے انوار و تخلیات کی دُعا مانگئے (پرماتما سے پرکاش کی پرارتھنا کیجئے۔

''میں اس درخشاں وجود کی عظمت اور شان کا دھیان کرتا ہوں جو اس کائنات کا (Feel the Fandom Share the Shirt) خالق ہے۔ میری دُعا ہے کہ وہ میری فکر کو جلا بخشے''۔

اسی خیال میں ڈوب کر دس پندرہ منٹ تک دھیان لگائیے۔ اپنے تجربات اپنے گرو (مرشد) کے سوا کسی سے نہ کہئے۔ جہاں تک ممکن ہو خاموش رہئے۔ ضرورت کے بغیر بات نہ کیجئے۔ اپنے خیالات نیکی اور بھلائی پر مرکوز رکھئے۔ یاد رکھئے جیسے ہمارے خیالات ہوتے ہیں آخر ہم ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ پاک اور مقدس خیالات تمام ذہنی ناپاکیوں کو جلا دیتے ہیں۔ پاکیزگی اور تقدس پر دھیان لگائے رکھنے سے تمام ناپاکیاں مِٹ جاتی ہیں۔ یوگ صدق و صفا حاصل کرنے کا عمل

ہے۔فقط یوگی ہی سچے معنوں میں پاک ہوتا ہے۔دوسرے لوگ تو دُنیا کی آلودگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔صرف یوگی ہی آزاد ہے۔باقی سب تو دُنیا کے غلام ہیں۔غلامی کی زنجیر کی ہر کڑی کو یکے بعد دیگرے توڑ کر ہی ہم اپنے خدا کے نزدیک آسکتے ہیں اور یقین مانئے کہ ہم سب اس حقیقت ازلی تک پہنچنے کی اہلیت اور طاقت رکھتے ہیں۔

روح عظیم کو فقط ہماری رُوح محسوس کر سکتی ہے۔اور اپنے رُوح کو پانے کا فقط ایک طریقہ ہے، کہ ہم اپنے جسم کے خیال سے اُوپر اُٹھ جائیں اور یوں سمجھنے لگیں کہ ہم رُوح ہی رُوح ہیں جسم ہیں ہی نہیں۔

یوگ کے مطابق ہمارے اعضاء کو دو مخصوص درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ داخلی یا ادراک اور احساس کے اعضاء

۲۔ خارجی یا حرکت کے اعضاء

یعنی ا۔گیان یا علم کے اعضاء ہیں اور ۲۔ عمل کے اعضاء ہیں۔باطنی اعضاء کو مجموعی طور پر ''منس'' یا ''من'' کہتے ہیں۔اس کے چار پہلو ہیں۔

۱۔ من یعنی ذہن۔غور وفکر کی طاقت، عام طور پر ہم اس طاقت کو استعمال کرنا نہیں جانتے۔ ہمیں اس پر قابو نہیں ہوتا اور یہ طاقت بے لگام ہو کر بے مُدعا بھٹکتی رہتی ہے اور اس طرح ضائع ہو جاتی ہے۔

۲۔ بُدّھی یعنی عقل و دانش ۔ بُدھی ہماری قوت ارادی ہے۔

۳۔ اہمکار (حساس شعور ہستی) یہ ہے خودی کے شعور میں ڈوبی ہوئی ''انا'' (یا ''میں'' کا اٹوٹ احساس)۔

۴۔ چِت (شعور واحساس کی بنیادی طاقت) یہی وہ چیز ہے جس میں باقی تینوں طاقتیں بستی ہیں۔اس سے اِن تینوں کی تشکیل ہوتی ہے۔اوراسی کے تحت یہ تینوں طاقتیں یا صلاحیتیں اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔یوں سمجھئے کہ ہستی کی عمارت کا فرش ہے جس پر باقی سب طاقتوں کی دیواریں کھڑی ہیں۔

یوگ ہمیں چت پر قابو پانا سِکھاتا ہے۔یہ وہ سائنس ہے جس کی مدد سے ہم چت کو مختلف صورتوں میں منقلب ہونے سے رُوک سکتے ہیں۔یوگ کے علم اور عمل سے ہم چت کو مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کا

رُوپ دھارن کرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اگر چت کو قابو میں کرلیا جائے تو ہماری خودی اپنی پوری آب وتاب سے نمایاں ہوجاتی ہے اور ہم اپنے آپ کو پہچان لیتے ہیں۔ یوگ کی مدد سے ہم اپنی مرضی کے مطابق من کو جسم سے علیحدہ کرسکتے ہیں۔ اپنے حواس پر پورا قابو پا کر ہم اپنے من کی طاقت کو ہاتھ میں لاسکتے ہیں اور اگر اس طرح ہم اپنے من کو پوری طرح اپنے اختیار میں لے آئیں گے تو تمام کائنات ہمارے اختیار میں آجائے گی۔ تمام دُنیا ہماری مطیع ہوجائے گی۔ رُوحانی زندگی اس وقت شروع ہوجاتی ہے جب ہم حواس کے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرلیتے ہیں۔ جب تک حواس ہم پر مسلط ہے ہم غلام ہیں۔ دُنیاداری حواس کی غلامی ہی کا نام ہے۔

اگر ہم اپنے من کے سمندر کو موٴجزن ہونے سے رُوک لیں یا اگر ہم اس من کو بالکل ساکن کرلیں تو جنم ومرن کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے گا۔ ہمارا مقصد حیات تو ہے اپنے کمال کو حاصل کرنا اور اُس کے لئے ہمیں اپنے مقصد کی طرف اپنے مرکز کی طرف لوٹنا ہے اور اس بات کا یقیناً احساس وشعور کرنا ہے کہ ہماری اصل یہ جسم نہیں یہ تو ہمارا دست بستہ غلام ہے۔ یوگ ہمیں یہی تو سکھاتا ہے کہ اپنے من کو اس جسم کی قید سے

آزاد کرو۔ اپنے جسم سے جدا کر کے اپنے اصلی وجود کا احساس کرو پھر دیکھو زندگی کس رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ جسم ہمارا غلام ہے۔ ہم جسم کے غلام نہیں۔ جسم ہمارے ہاتھ میں ایک آلہ کار ہے۔ جسم کے ہم مالک ہیں اور اس حقیقت کی مسلسل یاد دہانی اور یاداشت اور عمل سے ایک دِن ہم ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ کامیابی کا راز خاموشی اور عمل میں مضمر ہے۔



پرانایام

دوسرا سبق :

راج یوگ کے عمل کے لئے آٹھ باتیں ضروری ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۲۔ یم یا "یما" یا تہذیب نفس ۔اس پر یوگ کی بنیاد ہے۔ یوگ کے طالب کی تمام زندگی اسی کے تحت بسر ہونی چاہئے۔ طریقہ عمل کے پانچ حصے ہیں۔یعنی تہذیب نفس کے لئے پانچ ہدایتوں پر عمل ضروری ہے۔

ا۔ کسی کو خیال یا بول یا عمل سے نقصان نہ پہنچانا۔

ب۔ خیال، بول یا عمل سے کسی بھی شئے پر حریصانہ نظر نہ رکھنا۔

پ۔ خیال بول یا عمل میں پوری پاکیزگی۔

ت۔ خیال، بول یا عمل میں پوری صداقت۔

ٹ۔ کسی سے کچھ نہ لینا۔تحائف وغیرہ قبول نہ کرنا اور

ہر طرح سے بالکل بے نیاز ہو کر رہنا۔

۲۔ ''نیم''۔ یعنی تحفظ اُصول وضوابط۔ اس میں جسم کی دیکھ بھال، صحت وتوانائی کا خیال۔ روزانہ اشنان۔ خوراک کی پاکیزگی و اعتدال شامل ہیں۔

۳۔ ''آسن'' (ریاضت) اُس سے مُراد لشت کا طریقہ ہے۔ کمر مونڈھے اور سر کو ہمیشہ ایک سیدھ میں ہونا چاہئے تاکہ ریڑھ کی ہڈی کا راستہ یوگ کے عمل کے لئے بالکل صاف رہے۔

۴۔ ''پرانایام'' (تہذیب یا ضبط نفاس) اُس سے مراد انفاس (سانس) کی اپنی مرضی کے مطابق روکنا یا چلنے دینا ہے۔ اس مشق سے پران یعنی زندگی کی بنیادی قوت محرکہ پر قابو پانا مطلوب ہوتا ہے۔

۵۔ ''پرا۔تہارا'' اس سے مراد من کو باطن کی طرف لگانا اور باہر جانے سے روکنا ہے۔ زندگی کے لئے اس پر خوب غور کرنا۔

۶۔ دھرنا۔ یعنی یکسوئی میں کسی ایک موضوع پر غور کرنا۔

۷۔ ''دھیان'' یعنی غور وفکر

۸۔ سمادھی۔ (واقبہ) یہ ہے مقام انوار وتجلیات کا ہماری

تمام مشق اور ریاضت کا حاصل۔

یم اور نیم (تہذیب نفس اور تحفظ اُصول وضابطہ) زندگی بھر کی ریاضتیں ہیں۔ اِن کی مشق تمام عمر کرنا ہوتی ہیں۔ جہاں تک دوسری ریاضتوں کا تعلق ہے اِن کی مشق یکے بعد دیگرے کی جاتی ہے۔

جب تک پہلی منزل کی ریاضت میں کمال حاصل نہ ہو جائے اگلی منزل کی ریاضت کی مشق شروع نہیں کرنی چاہئے۔

ایک ریاضت کی مشق پوری طرح سمجھ کر اور اُسے درجہ تکمیل تک پہنچا کر ہی دوسری ریاضت شروع کرنا چاہئے۔

اس سبق کا موضوع ہے پرانا یام۔ یعنی پران (زندگی کی قوت محرکہ) پر اختیار پانا۔ راج یوگ کے عمل میں سانس کے ضبط و ترتیب سے پہلے انسان نفساتی سطح پر پہنچ جاتا ہے اور پھر رُوحانی سطح پر۔ پرانا یام ہمارے جسمانی نظام کی مرکزی کل ہے۔ راج یوگ کی بنیادی پرانام پر ہے۔ پرانا یام کا عمل پھیپھڑوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھیپھڑوں کا عمل دِل پر ہوتا ہے اور دِل کا دوران خون پر۔ دوران خون کی ترتیب و تنظیم مغز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مغز سے دِماغ (من) رنگ پکڑتا ہے۔ اس طرح راج یوگ میں پرانا یام کی مشق سے دِماغ (من) پر اختیار حاصل

کیا جاتا ہے۔اور جب انسان من پر قابو پالیتا ہے تو خارجی دُنیا خود بہ خود اُس کے مطیع ہو جاتی ہے۔ ہماری قوت ارادی عین اُس طرح اثر پیدا کرسکتی ہے جس طرح خارجی واقعات یا احساسات ہماری قوت ارادی اور طاقت عمل کو بیدار اور محرک کرتے ہیں۔ عموماً ہماری قوت ارادی کمزور ہوتی ہے۔ہم مادّی چیزوں سے اس قدر چپٹے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنی لطیف دِماغی طاقت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارادے اکثر خارجی اثرات سے تشکیل ہوتے ہیں اور ہمارے اعمال خارجی محرکات سے وجود میں آتے ہیں۔ خارجی فطرت کے متواتر دباؤ سے ہمارا توازن قائم نہیں ہرتا اور ہمارے پاؤں زندگی کے میدان میں لڑکھڑا جاتے ہیں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے۔ وہ بھی کیا زندگی ہے جو خارجی فطرت کا غلام ہو کر بسر کی جائے۔

دُنیا کے اولیاء اور مذہبی رہنما ہماری اندرونی طاقت کا زندہ ثبوت ہیں۔اُن بزرگوں نے پہلے اپنی داخلی کائنات کو تسخیر کیا۔اپنے باطن کے عالم شعور وادراک پر فتح پائی اور پھر خارجی دُنیا کے سامے یقین وایمان کی بے پناہ طاقت کو کچھ ایسے آشکارہ کیا کہ تمام دُنیا اُن کے قدموں پر جھک گئی۔ یوگ اسی اندرونی طاقت کو حاصل کرنے کا علم ہے

اور اُس کے لئے پرانا یام کا عمل پہلی سیڑھی کا درجہ رکھتا ہے۔

پرانا یام کے عمل کے تین حصے ہیں:

۱۔ پوروک یعنی سانس اندر کو لینا۔

۲۔ کُمبھک۔ یعنی سانس اندر ہی روکنا۔

۳۔ ریچھک۔ یعنی سانس باہر کو نکالنا۔

علم یوگ کے مطابق ہمارے مغز سے دو لہریں اُٹھتی ہیں جو ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب گھومتی ہوئی واپس مغز کو آجاتی ہے۔ اِن لہروں کا نام "پنگلا" اور "ایڈا" ہے۔ پنگلا کو آفتابی یا سورج مکھی لہر بھی کہتے ہین اور "ایڈا" کو ماہتابی یا چندر مکھی بھی کہتے ہیں۔ یوگ کے عمل یعنی دھیان یا یکسوئی سے ہم انہیں محسوس بھی کر سکتے ہین اور جسم کے تمام حصوں میں اِن کی موجودگی کا پتہ بھی لگا سکتے ہیں۔ یہ آفتابی اور ماہتابی لہریں جن سے زندگی قائم ہے ہمارے سانس سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سانس پر قدرت حاصل کر کے ہم جسم پر پوری طرح قابو پا سکتے ہیں۔ یوگی اِن لہروں کو ریڑھ کی ہڈی کے گرد گھومنے کے بجائے اس کے بیچ سے گذرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور جب یہ لہریں مل کر ریڑھ کی خلا سے گذرنے لگتی ہیں تو وہ آگہی کی لہریں بن جاتی ہیں اور انسان

پر علم معرفت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ سعادت صرف یوگی ہی کا حصہ ہے اور یوگی "پرانا یام" سے اس مقام پر پہنچتا ہے۔

یاد رہے کہ سب کے لئے ایک ہی طریقہ عمل کارگر نہیں ہو سکتا۔ جو جس کے لئے موزوں ہو اُسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ گیانی کے لئے گیان یوگ، کرم کرنے کی ہمت رکھنے والے کے لئے کرم یوگ۔ اور عشق الٰہی میں ڈوب جانے کی تمنا رکھنے والے کے لئے بھگتی یوگ۔

جہاں تک پرانا یام کا تعلق ہے اس کا اُصول یہ ہے کہ سانس میں ہم آہنگی اور توازن ہونا چاہئے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شروع شروع میں مشق کے لئے سانس گن کر لئے جائیں۔ لیکن چونکہ سانس کے ساتھ ساتھ گنتی کرنا بالکل میکانکی طریقہ ہے اس لئے گنتی کے بجائے ہم "اوم" کا مقدس لفظ استعمال کر سکتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ "اوم" کو دوہرا کر اس میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ "اوم" کی بار بار تکرار سے سانس، اوم ہی کے وزن پر چلنے لگے گا۔

پرانا یام کا طریقہ یہ ہے۔ ناک کا دایاں نتھنا انگوٹھے سے بند کرو۔ پھر بائیں نتھنے سے سانس اندر کو لینا شروع کر دو اور ساتھ ساتھ من میں چار بار لفظ "اوم" کو دہراؤ پھر انگوٹھے کے پاس والی انگلی بائیں

نتھنے پر رکھو اور دونوں نتھنے مضبوطی سے بند کر کے سانس رُوک لو اور من
میں آٹھ بار اوم کہو۔ اس کے بعد دائیں نتھنے سے انگوٹھا ہٹا لو اور آہستہ
آہستہ سانس خارج کرو اور ساتھ ساتھ من میں چار بار اوم کہو۔ اب یہی
عمل دہراؤ لیکن اب کے بائیں کے بجائے دائیں نتھنے سے سانس لو
اور پہلے کی طرح سانس لیتے وقت شبدھ اوم چار بار سانس روکتے وقت
آٹھ بار اور سانس چھوڑتے وقت پھر چار بار اوم شبدھ کا سمرن من میں
کرو۔ یعنی اندر اندر سے ہی اوم شبدھ پڑھتے جاؤ۔

ہر نشت میں یہ عمل دو بار کرو یعنی چار بار پرانا یام کرو۔ دو بار
ایک نتھنے سے اور دو بار دوسرے نتھنے سے۔ پرانا یام شروع کرنے سے
پہلے اگر تھوڑی سی پرارتھنا کر لی جائے تو بہتر ہوگا۔ اس عمل کی مشق ایک
ہفتہ تک متواتر کرنا چاہیئے پھر آہستہ آہستہ سانس لینے کا وقت بڑھاتے
جاؤ لیکن سانس لینے اور روکنے کے وقت میں وہی نسبت قائم رہنا
چاہیئے۔ یعنی اگر سانس لیتے وقت چار کے بجائے چھ بار اوم کہا تو
سانس خارج کرتے وقت بھی چھ بار اور سانس کے روکتے وقت بارہ بار
اوم کہو۔ پرانا یام کا عمل ہمیں رُوحانیت۔ پاکیزگی اور تقدس کے زیادہ
نزدیک لے جانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ لیکن یاد رہے کہ اس عمل سے

ہم میں جو قوتیں بیدار ہوں گی اُن کے استعمال سے ہمیں احتراز کرنا ہوگا۔ نہیں تو ہم رُوحانی اِرتقا کی شاہراہ سے ہٹ کر نفسیاتی طاقتوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائیں گے۔

راج یوگ کے ذریعہ پرماتما تک پہنچنا ہمت والوں کا کام ہے۔ اس میدان میں ذہنی جسمانی اور رُوحانی طاقت اور توانائی درکار ہے۔ یہاں تو ہر قدم پر اس بات کا دھیان رکھنا ہوگا کہ کامیاب بس وہی آدمی ہو سکتا ہے جس میں پرماتما کی خاطر سب کچھ ترک کر دینے کی ہمت ہے۔ اور ایسا آدمی کروڑوں میں ایک ہوتا ہے۔ جو منازل راہ کو ترک کرتا ہوا اس بات پر تُل جاتا ہے کہ ''میں'' ان سب مقامات سے پرے خود خدا تک جاؤنگا اور ضرور جاؤنگا۔

حقیقت کی تاب ہر کوئی نہیں لا سکتا۔ بہت کم لوگ حق کے جلال کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں واقعی کچھ حاصل کرنا ہے۔ اگر ہمیں واقعی خدا تک رسائی مطلوب ہے تو پھر اس مقصد کو پانے کے لئے جان کی بازی لگا دینا ہوگی۔



کنڈلینی

جیسا کہ پہلے سبق میں بتایا گیا ہے کہ علم یوگ کے مطابق دِماغ سے دولہریں آفتابی اور ماہتابی (پنگلا اور ایڈا) اُٹھتی ہیں اور یہ لہریں ہی جسم کے ہر حصہ کی قوت محرکہ ہیں۔ انہیں کی بدولت ہم زندہ ہیں۔ ہماری صحت تندرستی، طاقت وتوانائی اِنہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لہریں ہماری فوری ضروریات پوری کرنے کے علاوہ زندگی کی قوت کا ذخیرہ بھی پیدا اور مہیا کرتی ہیں۔ یوگ کے عمل سے اِن لہروں میں درخشندگی پیدا ہو جاتی ہے اور اِن کا رُخ موڑ کر ریڑھ کی ہڈی کے گرد گھومنے کے بجائے ریڑھ کی ہڈی میں سے ہو کر گذرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ جب یہ لہریں ریڑھ کی ہڈی کے بیچ سے ایک نیا راستہ نکال لیتی ہیں اور انسان اِس عمل میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو اپنے جسم سے بالکل جدا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُسے شعور ذات ہو جاتا ہے۔ اس نئے راستے کو ''سوشمنا'' کہتے ہیں۔

یوگ کے عمل کے لئے ریڑھ کی نیو کے قریب جو اعصابی مرکز ہے وہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ مرکز جنسی قوت کے مادّہ تخلیق کا خزانہ ہے۔ یوگی اس مرکز کا بیان یوں کرتے ہیں کہ ریڑھ کی نیو پر ایک مثلث ہے جس میں ایک چھوٹا سا اژدہا کنڈلی مارے سو رہا ہے اس سوئے ہوئے اژدہے کو کنڈلنی کہتے ہیں۔ اس کو جگانا (یعنی لہروں کو ریڑھ کی ہڈی کے بیچ میں سے گذرنے پر مجبور کرنا) ہی راج یوگ کا سارا مقصد ہے۔ اس عمل سے جنسی مادّہ کی زبردست قوت کا رُخ ہمارے جسمانی نظام کے تخلیقی مرکز یعنی دِماغ کی طرف ہوجاتا ہے، (دوسرے لفظوں میں ہم حیوانی درجے سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں) آہستہ آہستہ یہ طاقت دِماغ میں جمع ہوجاتی ہے اور ''اوجس'' یا رُوحانی طاقت کہلاتی ہے۔ نیک خیالات اور اچھے افکار سے اس طاقت کی ترقی ہوتی ہے۔ دُعائیں۔ پرارتھنائیں اور مُناجات اُس حیوانی قوت کو جو ہمارے جسم میں موجود ہے رُوحانی شکتی یعنی اوجس میں تبدیل کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ اس اوجس ہی کی بدولت انسان انسان کہلانے کا حقدار ہے۔ یہ رُوحانی طاقت صرف انسان ہی کے اندر پیدا ہوتی ہے اور انسان ہی کے وجود میں قیام کرتی ہے۔ جس آدمی کی تمام حیوانی

(جنسی) طاقت ''اوجس'' میں تبدیل ہو جاتی ہے وہ دیوتا کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یوگ کے عمل سے کوئی نئی طاقت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بڑی بڑی طاقتیں ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہمیں تو بس اُن پر قابو پانے اور اُن کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی طاقت ہاتھ میں آجاتی ہے۔

راج یوگ کے عمل کے لئے خیال، بول اور عمل میں پاکیزگی شرطِ اول ہے۔ اگر شادی شدہ لوگ اس یوگ کا عمل کرنا چاہیں تو اُنہیں بھی ازدواجی زندگی کو خیر آباد کرنا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی اپنے وجود کی سب سے بڑی طاقت کو ضائع کر کے رُوحانی منازل طے کر سکے۔ یاد رہے کہ پاک باطن و پاک نظر ہی خدا کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔

کنڈلنی کو بیدار کرنے کے لئے عملی ہدایات حسب ذیل ہیں:

پرانا یام سے پہلے کنڈلنی کی مثلث کا خیال کیجیئے۔ جتنی زیادہ طاقت آپ کے تخیل میں ہوگی اُتنا ہی جلدی آپ حسب منشا اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے اور کنڈلنی بیدار ہو جائیگی۔ اپنے خیال کو اس بات پر مرکوز رکھیئے کہ آپ کی کنڈلی جاگ رہی ہے۔

اپنی ماہتابی اور آفتابی لہروں کی حرکت کو محسوس کیجئے اور اُنہیں ریڑھ کی ہڈی کی راستے (سوشمنا) سے گذرتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کیجئے۔

ایسا سوچنے اور کرنے سے یوگ کے عمل میں کامیابی جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

من

یوگ کی پہلی منزل ہے حواس اور حسیات سے بالا اُٹھنا اور اس طرح یوگ کی معراج ہے من پر پوری طرح فتح پالینا۔ ہم جانتے ہیں کہ من بڑا چنچل ہے۔ ہر وقت اِدھر اُدھر مارا پھرتا ہے۔ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں۔ اس میں یکسوئی پیدا کرنا واقعی مشکل ہے۔ لیکن قوت ارادی پہاڑوں کے سینے میں سوراخ کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنی قوتِ ارادی سے اِس من کو گرفت میں لانا ہے۔ اِسے ٹھہرنے پر مجبور کرنا ہے اور بھگوان کے دھیان میں لگانا ہے۔ اسے دُنیا کے خیالات سے ہٹا کر عظمت اور جلال کے خیال پر مرکوز کرنا ہے اور اُس کے لئے مشق اور بار بار مشق کی

ضرورت ہے۔

من کو اپنی گرفت میں لانے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ چپ چاپ بیٹھ جائیے اور اِسے تھوڑی دیر کے لئے جہاں چاہئے بھٹکنے دیجئے۔ ساتھ ہی ساتھ اِس خیال کو مضبوطی سے تھامے رکھئے کہ "میں اپنے من کی آوارگی کا تماشہ کر رہا ہوں۔ میں اپنے من سے جدا ہوں۔ پھر دیکھئے کہ آپ کا من بھی یہ سوچنے لگے گا کہ وہ آپ کی ہستی سے جدا رہے۔ غور وفکر کے اس مقام پر جب آپ اور آپ کا من ایک دوسرے سے علیحدہ نظر آنے لگیں تو اپنے آپ کو خدا سے وابستہ کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہ سوچئے کہ آپ کی ہستی خدا کے وجود میں شامل ہے۔ خود کو اس خیال پر قائم رکھئے کہ میں من نہیں۔ میں تو من کا مشاہدہ کرنے والا ہوں۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ میرا من کس طرح سوچ وچار کرتا ہے۔ میں تو اپنے من کے ہر ارادے، ہر حرکت اور ہر عمل کا تماشہ کر رہا ہوں۔ اس طرح متواتر خیال کرنے سے آپ کی اپنے من سے وابستگی روز بروز کم ہوتی چلی جائے گی یہاں تک کہ آخرکار آپ اپنے آپ کو من سے بالکل الگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور واقعی محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کی ہستی من کے وجود سے علیحدہ ہے۔ جب

آپ اس مقام پر پہنچ جائیں گے تو آپ کا من بالکل آپ کے مطیع ہو جائے گا اور ایک غلام کی طرح آپ کے اشاروں پر چلے گا۔

مشق اور ریاضت کے لئے ضروری ہے کہ آپ جہاں تک ممکن ہو اکیلے یا ایکانت میں رہیئے۔ جس جگہ بیٹھ کر آپ یوگ کی مشق کرتے ہیں وہ زمین سے یعنی فرش سے کچھ اُونچی ہونی چاہیئے۔ لیکن اسقدر نہیں کہ اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہو۔ پہلے اپنی نشست پر چٹائی بچھایئے۔ اس پر نرم کھال اور سب سے اُوپر ریشمی چادر بچھا دیجئے۔ مشق کے دوران یوں قائم رہیئے کہ ہلنے کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔

سب سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ ہم اپنے من کو ساکن کریں۔ خیالات کی لہروں کو پیدا نہ ہونے دیں تا کہ ہمیں اپنی گہرائی اور وسعت کا پورا احساس ہو۔ ہمیں دِماغی بُت سازی اور صنم پرستی کو بند کرنا ہوگا۔ ہر قسم کے دِماغی تصویر کشی کو چھوڑنا ہوگا۔ جب ہمارے من میں کوئی اور چیز نہیں رہے گی تو خدا کا ہی جلوہ نظر آئے گا۔ اس لئے ہمیں خود کا پورا نگہبان ہونا پڑیگا کہ جونہی کوئی خیال من میں اُٹھتا نظر آئے اُسے فوراً وہاں سے نکال دیا جائے۔ یہ کام نہایت مشکل ہے لیکن دراصل یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے اور اس کے لئے تمام عمر مسلسل

کوشاں رہنا ہے۔

دھیان اور گیان کی زندگی ہماری ہستی کا بلند ترین مقام ہے۔ انسان کی زندگی تو غور وفکر کی زندگیہے۔ انسان کے لئے تو اسی میں سچا سرور ہے جب رُوح اپنے آپ کو پالیتی ہے تو ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور حسن کائنات ہمارے سامنے پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوجاتا ہے۔ من اور من میں پیدا ہونے والے خیالات ہی انسان کی زندگی کو بنا اور سنوار سکتے ہیں۔ جیسے کسی کی نظر ہوتی ہے، جیسے وہ سوچتا ہے ویسے ہی اُسے دُنیا نظر آتی ہے۔ اگر ہم پاک نظر ہیں، ہم اپنے من میں پاک خیالات پیدا کرتے ہیں تو ہمیں دُنیا میں برائی دِکھائی ہی نہیں دیگی۔ یہ تمام کائنات ہماری ہی تخلیق ہے۔ ہمارے لطیف خیالات ہی ٹھوس صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

تخیل ہمارا بہت بڑا دوست اور مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ جہاں عقل و ادراک کی رسائی نہیں وہاں تخیل کی پہنچ ہے۔ جہاں مدرکات کے دیئے بجھ جاتے ہیں وہاں تخیل کی روشنی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اسی لئے تخیل سے بجا کام لو۔ بلند ترین خیال اناالحق کا خیال ہے۔ ''میں'' ''وہ'' ہوں کے خیال میں بس کر زندگی بسر کرنا ہی یوگ کا عملی

مقصد ہے۔ جسے الہام کہتے ہیں وہ کوئی خارجی چیز نہیں۔ الہام باطن سے ہوتا ہے۔ اگر ہم اِلقا کی روشنی کے طالب ہیں تو ہمیں اپنی اعلیٰ ترین قوتوں کو کام میں لا کر یہ روشنی خود اپنے اندر پیدا کرنا ہوگی۔



پانچواں سبق

پرتہار اور دھارنا

پرتہار کے معنی ہیں من کو اِدھر اُدھر سے سمٹ کر مطلوبہ شے پر مرکوز کرنا، من کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ من ہے کہاں، اس لئے مشق کا پہلا قدم یہ ہے کہ من جہاں جاتا ہے اُسے جانے دیجئے۔ صرف دیکھتے جایئے کہ کہاں کہاں بھٹکتا ہے۔ کیا کیا سوچتا ہے۔ اس کے بعد ایسے ایک مرکز پر لانا ممکن ہو جائے گا۔ آخر من رُوح نہیں ہے۔ یہ تو مادّہ ہی کی ایک لطیف صورت ہے۔ جیسے ہم جسم کے مالک ہیں ویسے ہی من پر بھی ہماری ملکیت ہے اور ہم اپنی اعصابی قوتوں سے کام لیکر اُسے اپنی فرضی کے مطابق چلا سکتے ہیں۔ ہماری ذات جسم اور من سے بالا ہے۔ ہم آتما ہیں۔ جسم اور من دونوں ہمارے وجود سے قائم ہیں۔

اس لطیف طاقت کو بس میں لانے کے لئے ہی پرانایام کا عمل برتا جاتا ہے۔ جب سانس بائیں نتھنے سے چل رہا ہو تو آرام کرنیکی علامت ہوتی ہے۔ اُس وقت آرام کر لینا چاہیئے۔ جب سانس دائیں

نتھنے سے چلے تو وہ کام کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن جب سانس ہموار ہو کر دونوں نتھنوں سے برابر چل رہا ہو تو وہ وقت دھیان کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ہمارے جسم میں توازن اور سکون ہوتا ہے۔ یہی حالت غور و فکر اور دھیان و گیان کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ باقی وقت میں یکسوئی کی کوشش فضول ہوتی ہے۔

پرانا یام کی مشق سے خیالات آہستہ آہستہ خود بخود بس میں آجاتے ہیں اِس کی مشق برابر جاری رکھنا چاہئے۔ جب انگوٹھے اور اُنگلی سے نتھنوں کو بند کرنے کی کافی مشق ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ قوت ارادی یا صرف خیال ہی کی مدد سے ایسا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس مقام پر پرانا یام کے عمل میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر عامل کسی خاص ''اشٹ'' (یعنی بھگوان کی کوئی مخصوص صورت اوتار، پیغمبر، محبوب آدرش پر ایمان رکھتا ہو تو سانس لیتے وقت اور نکالتے وقت اوم کے بجائے اپنے اشٹ کا نام لینا چاہئے۔ اور سانس روکتے وقت لفظ ''ہوم'' کا استعمال کرنا چاہئے۔ رُکے ہوئے سانس کو بالتواتر کہتے ہوئے کنڈلنی یعنی ریڑھ کی نیو کے اژدہے کے سر پر بار بار زور سے دے ماریئے اور خیال کیجئے کہ عمل اُسے جگا دے گا۔

دوسرا یہ سوچئے کہ آپ کی خودی خدا سے وابستہ ہے۔آپ پرماتما سے متصل ہیں۔ اس طرح آپ اپنے آپ کو اپنے من سے جدا کرلیں گے۔اس کے بعد آپ کے خیالات دے یادوں آپ کے من میں نہیں آپائیں گے۔ جب بھی کوئی خیال آپ کے من میں اُٹھے گا آپ اُس کی آمد سے اچھی طرح آگاہ ہوں گے۔ یا یوں کہئے کہ ہر خیال اپنی آمد کا اعلان کر کے آئیگا۔اور ہم اس راز سے واقف ہوجائیں گے کہ من میں خیال کیونکر اور کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی خیال کے شعوری سطح پر آنے سے پہلے ہم جان لیں گے کہ اب من کیا سوچنے والا ہے۔ جس طرح تمام زندگی کی سطح پر ہم دور ہی سے کسی کو آتا دیکھ لیتے ہیں اُسی طرح داخلی دُنیا میں بھی ہم خیالات کو اُٹھتا ہوا دیکھ پائیں گے۔ یہ وہ مقام ہے جب ہم اپنے آپ کو اپنی ذات سے بالکل علیحدہ جدا کر پاتے ہیں اور اپنی ذات کو اپنے خیالات سے علیحدہ دیکھنے لگتے ہیں۔ یوگ یہی ہے کہ خیالات کو اپنی ذات پر غالب نہ آنے دیا جائے۔اور اپنی ذات کو من سے علیحدہ کر کے خیالات کا دور سے تماشہ کیا جائے۔اس طرح سے تمام خیالات خود بخود مر جاتے ہیں۔پہلے عام خیالات کی جگہ تقدس کے خیالات دِل میں بھر لیجئے پھر ان مقدس خیالات کی پیروی

کرتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ چلتے جائیے حتیٰ کہ یہ خیالات بھی آہستہ آہستہ مٹ جائیں اس مقام پر قادرِ مطلق (یعنی خدا کا) جلوہ آپ کے سامنے موجود ہوگا۔ خدا کے خیالات کے ساتھ ساتھ اس مقام تک آجائیے جہاں خیال کا بھی گذر نہیں، جہاں خیال گھل جاتا ہے۔ خدا کے خیال کے ساتھ گھل جائیے پھر خدا ہی خدا ہوگا۔

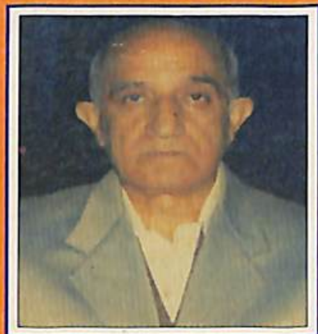
یوگ کے عمل کے دوران آپ کو مختلف رُوحانی تجربات حاصل ہونگے اور رُوحانی جلوے نظر آئیں گے۔ مثلاً یوگی اُن نورانی حلقوں کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ جو انسان کے نور باطن کی علامت ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں کوئی چہرہ شعلوں سے گھرا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔ ان شعلوں کی روشنی میں ہم اس کردار کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو شناخت ہوتی ہے وہ ہمیشہ بے خطا ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا اشٹ (یعنی بھگوان کی وہ مخصوص صورت جس کو ہم پوجتے ہیں مثلاً اوتار۔ پیغمبر) ہمارے سامنے جلوہ گر ہو۔ ایسی حالت میں ہم اس منور جلوے میں مگن ہو کر اس پر یکسوئی سے دھیان لگا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھوں دیکھی چیز کو کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یوں تو ہم اپنے تمام حواس کے ذریعہ کسی شئے کا تصور کر سکتے ہیں لیکن جو تصور کسی کو آنکھوں سے دیکھ کر

قائم ہو جاتا ہے وہ زیادہ صاف اور دیر پا ہوتا ہے۔ ہمارا تصور اور تخیل زیادہ تر ہماری نظر سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یوگ کے عمل میں اپنے تخیل کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے خیالات کا پاکیزہ اور مقدس ہونا بھی اہم ہے۔ ہر ایک شخص کی قوت متخیلہ اپنی اپنی خاصیتیں لئے ہوتی ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ہر شخص کو اُس راہ پر چلنا چاہئے جو اُس کے لئے فطری طور پر موزوں ہو۔ اس سے یوگ میں آسانی ہوتی ہے۔ جو صورت ہماری آج ہے وہ پچھلے جنموں کے کرموں کا نتیجہ ہے۔ مختلف جنموں میں ہماری صورت مختلف ہو سکتی ہے لیکن ہماری ذات ہماری اصل ایک ہے۔ آخر ہمیں اس حقیقت کو پانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ عمل سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ خوشی خوشی اور ہمت باندھ کر عمل کئے جائیے، کامیابی یقینی ہے۔ صبر و تحمل سے کام لیجئے۔ استقلال اور استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ جسمانی اور دماغی پاکیزگی کا خاص خیال رکھئے۔ روز غسل کیجئے۔ خیالات کو پاک اور صاف رکھئے۔ آخر ایک دن آپ یوگی ضرور بن جائیں گے۔ جلد بازی مت کرو۔ مشق کے دوران اور عمل کے میدان میں زبردست روحانی اور نفسیاتی قوتیں ہاتھ آئیں تو بھی اُن کو میل راہ سمجھ کر پیچھے چھوڑ دو اور آگے

بڑھتے جاؤ۔ یاد رکھو یہ قوتیں غیر محتاط آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دیکھنا کہیں یہ قوتیں اپنی راہ سے بہکا نہ دیں۔ بس ایک خدا کو ہی اپنا سچا مقصد بنائے رکھو۔ صرف ابدیت کی تلاش کرو جسے پانے کے بعد سدا کے لئے چین اور سکون مل جاتا ہے۔ جب کُل کو پالیا تو پھر رہ کیا گیا۔ اُسے پانے کے بعد تمہارا وجود کامل اور آزاد ہو جاتا ہے۔ ہمیں اکملیت کا وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جسے "ست چت آنند" کا نام دیا گیا ہے۔ جہاں ہمارا وجود کامل ہمارا علم (گیان) اور ہمارا سُرور (آنند) کامل ہو جاتا ہے۔



JOWHARE KAYINATH (URDU)



MAHARAJ KRISHEN MAWA MASROOR

1. M.K.Mawa
2. Pen Name : Masroor
3. Father's Name : Late Shri Nand Lal Mawa
4. Date of Birth : October-1937
5. Birth Place : Bohri kadal Srinagar-Kashmir (INDIA)
6. Present Address : House No.-137- Lane No.1
H.no.2 Anupam Garden
Sainik Farms , New Delhi-110030
Contact No.9810056225 , 09810259954

7. Publications
(A) Bakshanhar T Surgik Wat Pad (Kshmiri) 1985
(B) Jowhare Kayinath (Spiritual Science – Urdu) Dec 2011

8. Publications in press
(a)Desi Dawa-Ta-Desi Elaj (Herbal Treatment) Kashmiri
(b)Benav Sharuk Potel : Kashmiri Short Stories
(c) Wath Ma Chhi Rawan : Kashmiri Poetry
(d) Pond Chud : Translator of Russian Short Stories in Kashmiri For Children

FUNKAR CULTURAL ORGANISATION
P. B. NO. 1112, SRINAGAR-1, KASHMIR , CONTACT NO.09419092468

